اشاعت کا ۹۷ واں سال
زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اکتوبر ۲۰۱۹ء
۱۵؍روپئے

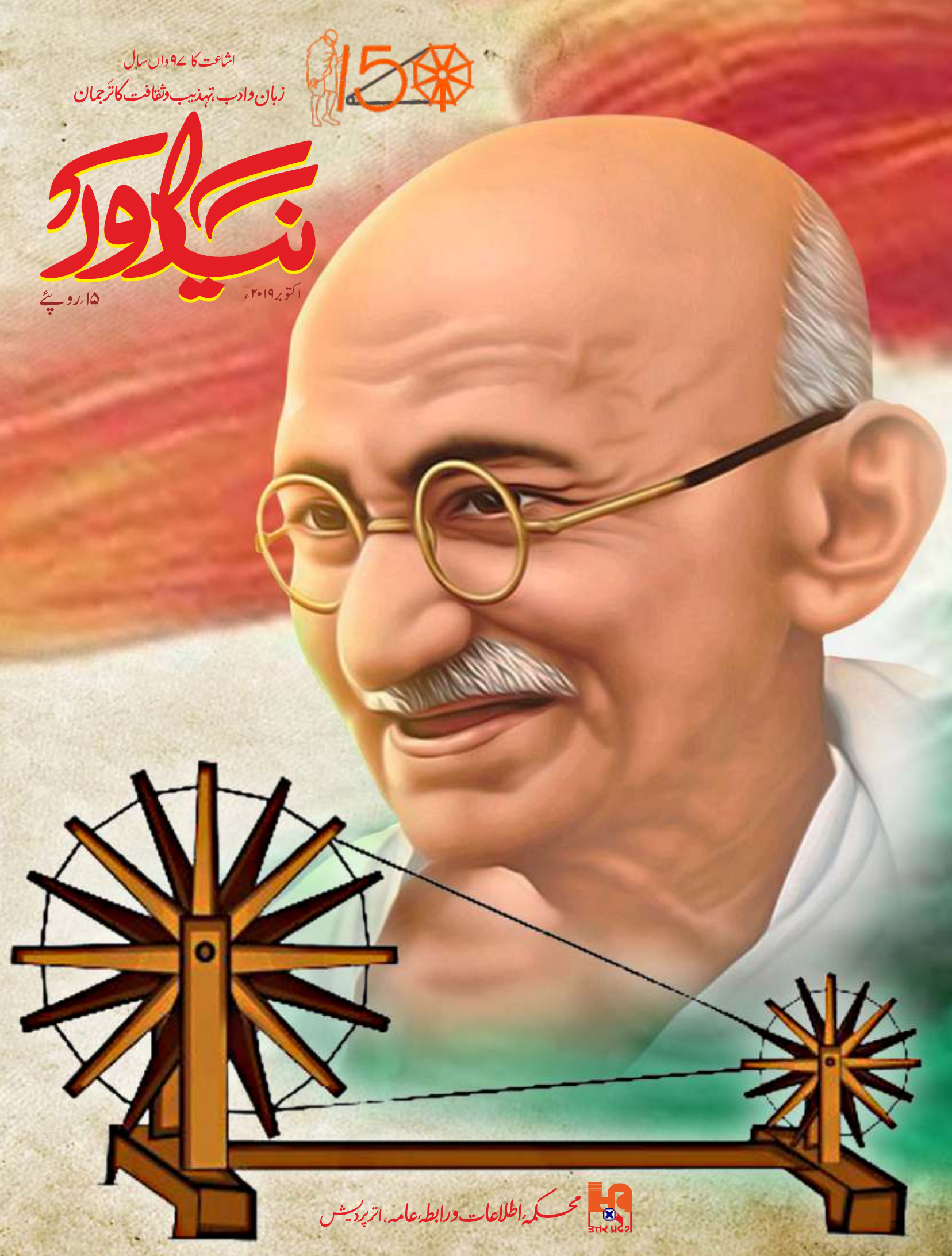

محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

اتر پردیش کی گورنر عزت مآب آنندی بین پٹیل حضرت گنج، لکھنؤ واقع
گاندھی آشرم میں گاندھی جینتی کے موقع پر چرخہ چلاتی ہوئیں (۲/اکتوبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ حضرت گنج، لکھنؤ واقع
گاندھی آشرم میں گاندھی جینتی کے موقع پر چرخہ چلاتے ہوئے (۲/اکتوبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر عزت مآب آنندی بین اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
اودھ شلپ گرام میں مہاتما گاندھی کی زندگی پر مبنی نمائش کا جائزہ لیتے ہوئے (یکم اکتوبر ۲۰۱۹ء)

جلد : ۷۴ شمارہ:۶

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اکتوبر ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

انجم نقوی ، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

گوشۂ منظومات

مہاتما گاندھی ..... منور سلطانپوری ۳

گاندھی جی اور تحریک خلافت ..... ڈاکٹر رؤف خیر ۴

مضامین

گاندھی جی کی شخصیت زبان و بیان کے حوالے سے ..... ثوبان احمد ۵

گاندھی جی کی صحافتی خدمات اور اس کے سیاسی مضمرات ..... ڈاکٹر منور حسن کمال ۹

گاندھی جی اور سیاسی محاذ آرائی ..... عمیر منظر ۱۳

گاندھی جی کی قیادت اور ان کا تصور عدم تشدد ..... ڈاکٹر محمد یٰسین ۱۶

مہاتما گاندھی، ماحولیات اور انسانی حقوق ..... ندیم حسنین ۱۹

مہاتما گاندھی کے طبی افکار و تجربات ..... ڈاکٹر عبدالسمیع ۲۱

گاندھی جی اور ہندی اردو کا مسئلہ ..... ڈاکٹر شاہنواز فیاض ۲۸

مہاتما گاندھی: اردو شاعری کے آئینہ خانے میں ..... اشتیاق احمد ۳۳

بیسویں صدی میں گاندھی جی پر لکھی گئی نظمیہ شاعری کی روایت ..... محمد ارشد کسانہ ۳۸

اردو شاعری میں گورو نانک جی کی عظمت ..... ڈاکٹر ریحان حسن ۴۲

سکھ مت اور تصوف ..... ڈاکٹر نزیش ۴۸

اودھ کے غیر مسلم شعراء کی ادبی خدمات ..... شہباز عالم ۵۳

علامہ اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر ..... ڈاکٹر کہکشاں خاتون ۵۷

تاثرات

میرا پہلا اسکول ..... پروفیسر شمیم حنفی ۵۱

افسانے

حسین خواب ..... محمد نہال افروز ۶۲

خاموش آوازیں ..... فیاض حمید ۶۵

غزلیں

غزلیں ..... کاشف بن قمر مرادآبادی، طلحہ تابش ۶۸

غزلیں ..... کے انیس اظہر، مشیر مصطفوی ۶۹

تبصرہ

جگر فن اور شخصیت (مصنف: پروفیسر شارب ردولوی) ..... مبصر: ڈاکٹر زیبا محمود ۷۰

خطوط

خطوط ۷۲

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

اکتوبر کا مہینہ ہمارے کلنڈر کا ایک بہت اہم مہینہ ہے۔موسم کے لحاظ سے بھی اس مہینہ میں تبدیلیاں آنی شروع ہوجاتی ہیں۔دیوالی کا تہوار بھی اسی مہینہ میں یا اس کے آس پاس ہوتا ہے اس طرح ہماری کئی تہذیبی وراثتیں اس مہینہ سے وابستہ ہیں۔اس مہینہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بابائے قوم راشٹر پتا مہاتما گاندھی کی پیدائش کا مہینہ ہے اس لئے ہم خاص طور پر اس مہینہ میں مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں پھر یہ تو ان کا 150 واں جنم دن تھا اس لئے اسے اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ منایا گیا۔نیا دور بھی اپنے تئیں علمی وادبی سطح پر جو کرتا رہا ہے اسے اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی۔اس بار ہم نیا دور کے صفحات کی ابتدا مہاتما گاندھی کو منظوم خراج عقیدت سے کر رہے ہیں۔سب سے پہلے مہاتما گاندھی پر منور سلطانپوری کی نظم مہاتما گاندھی اور اس کے بعد ڈاکٹر رؤف خیر کی نظم گاندھی جی اور تحریک خلافت پیش خدمت ہے۔

نثری مضامین میں گاندھی جی کی شخصیت، ان کا نظریہ اہنسا اور تصور عدم تشدد اور زبان کے مسئلہ پر ان کے نظریات سے متعلق مضامین پیش خدمت ہیں۔ان مضامین میں ہمارے قلم کاروں کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہم گاندھی جی کے نظریات کو سمجھ سکیں اور بہتر طریقہ پر لوگوں تک پہنچا سکیں۔گاندھی جی نے اپنی زندگی میں مختلف موضوعات پر گفتگو کی اور اپنے اخبار میں ان کے بارے میں مضامین لکھے، ہم نے کوشش کی ہے کہ ہم نیا دور کے اس آئینہ خانہ میں ان کی فکری شخصیت کی ہر تصویر نمایاں کر سکیں۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ گاندھی جی اپنی طبیعت کی خرابی میں ڈاکٹر کو دکھانے کے بجائے عام طور پر اپنا علاج خود کیا کرتے تھے یا ان کے آشرم میں کوئی بیمار ہو جاتا تو خود دوا دے دیتے تھے۔ان کی اس طرح کے طبی تجربات پر بھی ہم اس شمارے میں ایک مضمون شامل کر رہے ہیں کہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

اس سال ایک خصوصیت اور تھی کہ یہ مہاتما گاندھی کی پیدائش کا 150 واں سال ہے لہٰذا اس کی رعایت سے کئی طرح کے ریکارڈ بنانے کی کوشش کی گئی۔ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں اس موقع پر گاندھی جی کے سلسلہ میں کوئی بڑا جلسہ نہ ہوا ہو۔سرکاری طور پر بھی اس موقع پر بعض ریکارڈ بنائے گئے۔یو پی سرکار نے بھی زبردست پیمانہ پر مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ہمارے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے 36 گھنٹے مسلسل ودھان سبھا کا اجلاس چلا کر دنیا میں ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جس کی آج تک کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔اس طرح ایک انوکھے انداز میں انھوں نے راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

چونکہ نومبر اور دسمبر کا شمارہ گورکھپور سے منسوب کیا گیا ہے لہٰذا شری گرونانک جی کی ۵۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے ایک ماہ قبل ہی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دو مضامین شامل اشاعت کئے ہیں۔ان کے ذریعہ ہماری کوشش ہے کہ ہم گرونانک دیو جی کی عظمت ان کی بڑائی ان کے فلسفہ کے ساتھ سکھ مت کا جو رشتہ تصوف سے ہے اسے سمجھ سکیں۔

ان مضامین میں ایک مضمون اودھ کے غیر مسلم شعرا پر اور ایک اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی پر شامل اشاعت ہے یہ مضامین بھی ایک طرح سے اسی کا حصہ ہیں اس لئے کہ اسی یکجہتی اور محبت کو ان میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی اردو کے معتبر اور بہت اہم ناقد ہیں لیکن اس بار ہم ان کا کوئی تنقیدی مضمون شائع کرنے کے بجائے ان کی زندگی میں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمارے یہ عظیم قلم کار آخر ہماری ہی طرح کبھی کسی اسکول میں پڑھے ہوں گے۔ان کے ماسٹر کون تھے کن سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ایسے سوالات اکثر بڑے ادیبوں کے بارے میں ذہن میں اٹھتے رہتے ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اس مضمون میں اپنے پہلے اسکول کا حال تحریر کیا ہے۔یہ مضمون دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کی ایک کڑی ہے۔

اس شمارے میں افسانوں اور غزلوں کی کمی نہ محسوس ہو اس لئے دو افسانے اور چند غزلیں شامل اشاعت ہیں اس کے علاوہ ایک نئی کتاب پر تبصرہ اور آپ کے چند خطوط بھی پیش خدمت ہیں مجھے امید ہے کہ اکتوبر 2019 کا یہ ہمہ رنگ شمارہ آپ کو پسند آئے گا ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

اپنی بات:

عرب حکما اور دانشوروں کو اپنی زبان پر اتنا فخر ہے کہ وہ دوسروں کو "گونگا" کہتے ہیں۔آپ کو اپنی زبان پر کتنا فخر ہے؟؟ اور آپ اس کی بقا کے لئے کیا کرتے ہیں؟ یہ ضرور سوچیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں۔

منور سلطانپوری
مکان نمبر 1533، محلہ شاستری نگر، سلطانپور
موبائل: 8009202986

وطن پہ ہے ترا احساں مہاتما گاندھی

وطن پہ ہے ترا احساں مہاتما گاندھی
ہر ایک تجھ پہ ہے نازاں مہاتما گاندھی

یونہی ملی نہیں میرے وطن کو آزادی
تھے اس کے واسطے کوشاں مہاتما گاندھی

چھڑانے قید سے اپنے وطن کے لوگوں کو
بڑھے تھے جانب زنداں مہاتما گاندھی

بغیر اسلحہ جیتی ہے جنگ آزادی
جہاں کو کر گئے حیراں مہاتما گاندھی

خود اسکو پورا کیا مائل عمل ہو کر
جو دل میں رکھتے تھے ارماں مہاتما گاندھی

بتا رہی ہے یہ کردار کی ضیا ان کے
تھے اک چراغِ فروزاں مہاتما گاندھی

وطن میں اپنے وہ انسانیت کا پیکر تھے
نہ ہندو تھے نہ مسلماں مہاتما گاندھی

نہ ان کا جشن ولادت منائے پھر یہ ملک
وطن کے جب تھے دل و جاں مہاتما گاندھی

مرے خیال پہ چھائے ہیں اے منورؔ وہ
ہیں میری فکر کا عنواں مہاتما گاندھی

ڈاکٹر رؤوف خیر
موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد (تلنگانہ)
موبائل: 9440945645

آزادیٔ نظر کا پیمبر مہاتما

آزادیِ نظر کا پیمبر مہاتما
جس کا نہیں تھا کوئی بھی ہم سر مہاتما

تھا ظالموں کی راہ کا پتھر مہاتما
مظلوم کے لیے گل خوش تر مہاتما

وہ یارِ خیر و دشمنِ ہر شر مہاتما
ہر حال میں وہ اندر و باہر مہاتما

انگریز کے دلوں میں بنا ڈر مہاتما
کردارِ بے مثال کا خنجر مہاتما

افسوس خود شکار وہ ہنسا کا ہوگیا
اپنی جگہ اہنسا کا پیکر مہاتما

مکار خوش لباسوں کو ننگا وہ کرگیا
کہنے کو تھا فقیر تونگر مہاتما

مجروح ہوکے رہ گئی جمہوریت کی روح
دریائے خیر و شر کا شناور مہاتما

صحرائے بے حسی کو مگر پار کرگیا
حساس کس قدر تھا وہ پیکر مہاتما

یم راج بھی بگاڑ نہ پایا ہے اس کا کچھ
جی کر مہاتما تھا وہ مرکر مہاتما

دنیا ہی اس کے پیچھے سدا بھاگتی رہی
شہرت سے بے نیاز قلندر مہاتما

دل سے اُسے پسند نہ کرتے تھے لوگ کچھ
پھر بھی کہا تو کرتے تھے منہ پر مہاتما

آخر ہمارے دیش کا کلیان کر گیا
کردار کا چراغ جلا کر مہاتما

وہ سنتِ رسول پہ گویا تھا گام زن
سرتا پا صبر و شکر کا پیکر مہاتما

فوج فرنگ بھی اُسے پسپا نہ کرسکی
تنہا تھا اپنے آپ میں لشکر مہاتما

اس نے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا
چشمِ کشادہ و دلِ مضطر مہاتما

اس کے قلم سے لعل و جواہر ٹپکتے تھے
گویا ابوالکلام کا ہمسر مہاتما

ہتھیار اپنے ہاتھ میں لیتا نہیں تھا وہ
اپنی جگہ تھا پھولوں کا بستر مہاتما

تھا اس کو ناپسند تشدد کا راستہ
وہ مہرباں خلوص کا پیکر مہاتما

ہم نے ہی اُس کے نام کو بٹّہ لگادیا
پہنچا تھا جس کا نام فلک پر مہاتما

افسوس ہم نے اس کو زمیں دوز کردیا
ورنہ بجائے خود وہ قد آور مہاتما

آزادی کا چراغ کبھی گل نہ ہو سکا
تھامے رہا ہواؤں میں ڈٹ کر مہاتما

سدِّ سکندری بھی اسے ریت کی لگی
دیوار میں بنا تا رہا در مہاتما

کیا کیا نہ دیکھتا ہے فقط بت بنا ہوا
چورا ہوں پرخموش ٹھہر کر مہاتما

اُس میں حلول سرمد و حلاج کر گئے
کہلاتا خیرؔ ورنہ وہ کیوں کر مہاتما

ثوبان احمد
ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی
رابطہ: 7631917877

گاندھی جی کی شخصیت زبان و بیان کے حوالے سے

’’باپو کے قدموں میں عقیدت کے پھول‘‘

تیر ے نغمہ نے کی تھی بانگ درا پیدا
ترے چہرے نے سچائی کے چہرے کو نکھارا تھا
تری شبنم حریف شعلۂ خورشید مغرب تھی
کہ تونے ظلمتوں میں صبح مشرق کو پکارا تھا
مجھے وہ دن ہے اب تک یاد اے با حوصلہ مانجھی
کہ جب تیری شکستہ ناؤ سے طوفان ہارا تھا
سزائے جرم حق گوئی میں اے سقراط حق پرور
دیا جاتا تو جام زہر بھی تجھ کو گوارا تھا
کفن بردوش جاگ اٹھی تھی روح بزم قربانی
دیار عشق کو جب دار سے تونے پکارا تھا

شمیم کرہانی

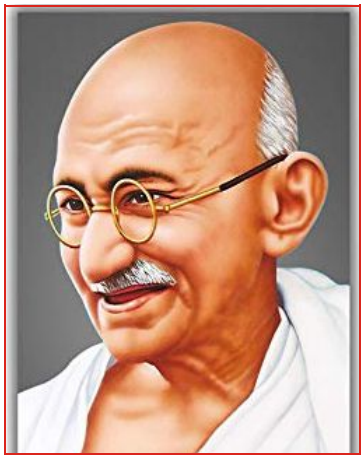

تمام ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والے، اتفاق واتحاد کے علم بردار، باپو اور مہاتما کہے جانے والے گاندھی جی ۲/اکتوبر 1869ء میں گجرات کے ایک گاؤ پور بندر میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ تاجر پیشہ تھا۔ یہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دھرم کی باتوں کو بھی بغور سنتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ گاندھی جی کا تعلیمی سفر بہت سہانا رہا۔ جب انہوں نے اسکولی تعلیم مکمل کر لی تو ان کے بزرگوں نے انہیں ولایت بھیج دیا۔ جہاں سے انہوں نے بیرسٹری میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔

انہیں کئی زبانوں پر دست رس حاصل تھا۔ گجراتی تو مادری زبان تھی لیکن انگریزی بھی اس قدر عمدہ بولتے گویا یہ بھی ان کی مادری زبان ہو۔ اس کے علاوہ اردو بہ آسانی پڑھ لکھ سکتے تھے۔ نیز بنگالی، ہندی اور تمل بھی جانتے تھے۔ انہوں نے تعلیم میں مادری زبان کا نظریہ، زندگی میں سچائی کا نظریہ، سماج میں بھائی چارہ کا نظریہ، عوام میں محبت کا نظریہ، انسان میں ظاہر و باطن کا نظریہ اور ہندوستان میں ہندی یا ہندوستانی زبان کا نظریہ پیش کیا ہے۔

وہ فرماتے تھے کہ جب تک بچوں کو اس کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جائے گی تب تک بچوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ اور ہمارا تعلیمی نظام درست نہیں ہو پائے گا۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت آج ہندوستان میں Three Language formola پر عمل ہو رہا ہے۔

گاندھی جی کو جھوٹ سے سخت نفرت تھی ان کا ماننا تھا کہ انسان کو ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ انسان کا ظاہر و باطن ایک ہونا چاہئے۔ قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ پورا سماج ایک ہوجائے۔ اخوت و بھائی چارگی عام ہو، عوام میں آپسی محبت برقرار رہے اور لوگوں میں جو نفرت کی بھاؤنا ہے وہ ختم ہوجائے۔ اسی لئے تو باپو کہتے تھے ''اگر تم اس کا احساس نہیں کر سکتے کہ دوسرے کا عقیدہ بھی تمہارے عقیدہ کی طرح سچا ہے تو کم از کم تمہیں اتنا ماننا چاہئے کہ دوسرے لوگ بھی اسی قدر سچے ہیں جس قدر کہ تم خود ہو''

یہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''مجھے خدا بھگوت گیتا میں نظر آتا ہے وہی انجیل میں اور قرآن مجید میں نظر آتا ہے۔''

گاندھی جی ایک بیرسٹر تھے جنہیں انگریزی زبان بھی مادری زبان کی طرح آتی تھی لیکن وہ ہندوستانی تہذیب اور کلچر کو بھولے نہیں تھے بلکہ اس پر اور شد و مد کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ وہ ہندوستان میں ہندی یا ہندوستانی زبان کے علاوہ تسلط برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے رسالہ ''ینگ انڈیا'' میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اکثر یہ بات ثابت کرنے کے لئے ملک کی مرکزی حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے۔ ہماری پچھلی تاریخ سے کوئی مثال پیش کردی جاتی ہے۔ مشترک زبان کی ضرورت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا، لیکن یہ انگریزی نہیں ہوسکتی، اہل کاروں کو دیسی زبان قبول کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ اس مسئلہ کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ڈیڑھ صدی کی برطانوی حکومت کے بعد بھی انگریزی ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں بن سکی ہے۔''(۱)

مہاتما گاندھی فرماتے تھے کہ انگریزی زبان بین الاقوامی تجارت کی زبان ہے اس زبان میں بھی قیمتی ادبی خزانے ہیں لہٰذا یہ زبان ہمیں صرف بقدر ضرورت سیکھنی چاہئے۔ تاکہ ہم اس کے ذریعے بین الاقوامی سفارت کے محکمے چلا سکیں اور اپنی قوم کو مغربی ادب، فکر اور سائنس سے آگاہ کر سکیں، نہ یہ کہ ہم انگریزی پر اتنا زور دیں کہ ہندوستانی زبان ہی ہم سے جاتی رہے۔ وہ ہندوستان میں انگریزی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سخت مخالف تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ''ہندوستانی ذہن کی اونچی سے اونچی ترقی انگریزی کے علم کے بغیر ممکن ہونی چاہئے۔''

شاید اسی رجحان کو دیکھ کر راجہ رام موہن رائے نے پیشین گوئی کی تھی کہ ''ایک دن ہندوستان ایک انگریزی بولنے والا ملک بن جائے گا۔''

لیکن ہم احسان مند ہیں ان تمام ہندوستانی ادیبوں کا جنہوں نے ہندوستانی زبانوں کے فروغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہندی اردو اور دیگر ہندوستانی زبان کو پروان چڑھانے میں ہمیشہ کمر بستہ رہے۔ اگر چہ آج بھی ہمارے ملک میں انگریزی کا جانکار اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے۔ اور زبان حال سے کہتا ہے ''من چوں دیگرے نیست'' اسی سوچ کو بدلنے کے لئے باپو نے کئی مضامین لکھے اور ۲۷/اپریل 1921ء کے ''ینگ انڈیا'' میں ایک مضمون شائع کیا اور عام لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا کہ

''میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ انگریزی تعلیم ایسے ڈھنگ سے دی گئی ہے کہ اس نے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کو ناکارہ بنا دیا ہے اس نے ہندوستانی طالب علموں کی اعصابی قوت پر زبردست بوجھ ڈالا ہے اور ہمیں نقال بنا دیا ہے۔ برطانیہ کے ساتھ ہمارے تعلق کا ایک سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس نے دیسی زبانوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ نقالوں کی ایک پوری نسل پیدا کردینے سے کوئی ملک ایک قوم نہیں بن سکتا۔'' (۲)

زبان و بیان کے اعتبار سے گاندھی جی کا نظریہ بالکل صاف تھا وہ ہندوستانی زبان کی ہمیشہ وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ ایک خاص میعاد کے اندر صوبائی سرکاروں عدالتوں اور قانون بنانے والی سبھاؤں کا کام کاج اسی صوبے کی زبان میں ہونا چاہئے، یعنی ہندوستانی زبان ہو۔ خواہ اس کی لکھاوٹ دیوناگری ہو یا فارسی، اور مرکز میں بھی ہر جگہ عام بول چال یعنی ہندوستانی زبان ہی ہونی چاہئے۔ اور پھر کہا کہ بین الاقوامی سفارت کی زبان انگریزی ہو۔

وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر جگہ ہندوستانی زبان کا دور دورا ہو یہاں تک کہ اگر کسی جلسہ یا سبھاؤں میں تقریر کا موقع ہو تو وہاں بھی ہندوستانی زبان ہی ہونی چاہئے۔ وہ اسے نہایت احمقانہ رویہ قرار دیتے تھے کہ جہاں کی عوام انگریزی سے نابلد ہو اور ان کے سامنے اسی بھاشا کا استعمال کیا جائے جسے وہ بالکل نہ سمجھتی ہو۔

گاندھی جی کے سامنے ایسے کئی مواقع آئے جب انہیں انگریزوں کے سامنے عوام کو خطاب کرنا تھا۔ تو انہوں نے انگریزوں سے معذرت کر کے ہندوستانی زبان میں تقریر کی، کیونکہ وہ یہ مانتے تھے کہ اگر آپ اپنی اچھی تقریر کا اثر عوام کے دلوں میں ڈالنا چاہتے ہیں تو آپ کو انہیں کی زبان میں بات کرنی ہوگی۔ نہیں تو آپ کی تقریر اس قول کا مصداق ہوگا۔

''بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگورائے''
در اصل گاندھی جی ہندوستانی زبان کو پرموٹ کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کو انگریزوں کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی آزادی دلانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں وہ کونسی زبان ہے جسے مرکزی حیثیت دی جائے جسے سب لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں۔لیکن جب ہم تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں تو ہمیں کافی مایوسی ہاتھ آتی ہے۔وہ اس لئے نہیں کہ یہاں کوئی ایسی زبان نہیں تھی جسے یہ مقام دیا جائے بلکہ اس وجہ سے کہ ہندوستان کئی زبانوں کا سرچشمہ ہے۔

یہاں عام طور پر ہندی، ہندوستانی اور اردو پر مسئلہ اٹکا ہوا تھا۔لیکن قربان جایئے باپو کی اس عظیم سوچ پر جنہوں نے تینوں زبانوں میں مطابقت کی کوشش کی اور کہا کہ یہ تینوں زبانیں ایک ہیں اس لئے ہندوستان میں ہندوستانی زبان ہونی چاہئے۔ان کی یہ سوچ تھی کہ ہمیں ہندی اور اردو کے جھگڑے میں پھنس کر نہیں رہنا چاہئے بلکہ انگریزی کے اثر ورسوخ کو دور کرنے کے لئے ہمیں بے حد محنت کرنی چاہئے۔

چنانچہ جب انہوں نے ہندی، اردو کے اختلاف کو بڑھتے دیکھا تو اس کی کئی مضامین لکھ ڈالے اور لوگوں کے بیچ جا کر اپنی بات رکھی کہ ہندوستان کی زبان ہندی یا اردو نہیں بلکہ ہندوستانی ہوگی۔انہوں نے ۹/مئی ۱۹۳۶ء کے رسالہ ہریجن میں کئی نکات پیش کئے۔

1۔ ہماری قومی زبان ''ہندوستانی'' کہلائے جائے نہ کہ ہندی۔

2۔ ہندوستانی زبان کا کسی فرقے کی مذہبی روایتوں سے کوئی خاص تعلق نہ سمجھا جائے۔

3۔ کسی لفظ کو دیسی یا بدیسی کی کسوٹی پر نہیں بلکہ اس کی رواج کی کسوٹی پر آنکا جائے۔

4۔ اردو زبان کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی زبان کے مسلمان تخلیق کاروں کے استعمال کئے ہوئے تمام لفظوں کو رائج مان لیا جائے۔

5۔ دیوناگری اور عربی دونوں لکھاوٹوں کو رائج اور قاعدے کے اندر مانا جائے، اور تمام ایسی اداروں میں جن کی پالیسی 'ہندوستانی' زبان کے حامیوں کے ساتھ ہے دونوں لکھاوٹیں سکھانے کا بندوبست کیا جائے۔''(۳)

مہاتما جی ایک بار ''بنارس ہندو یونیورسٹی'' میں تقسیم اسناد کے جلسہ میں بلائے گئے۔ وہاں کی انتظامیہ کی ساری کاروائی انگریزی زبان میں دیکھ کر باپو کو بہت تکلیف ہوئی اور برجستہ کہہ اٹھے آج مجھے بہت افسوس ہوا۔

''میرا خیال تو یہ تھا کہ کم سے کم یہاں تو ساری کاروائی انگریزی میں نہیں بلکہ قومی زبان ہی میں ہوگی۔ میں یہاں بیٹھا یہی انتظار کر رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی آخر ہندی یا اردو میں کچھ کہے گا۔ہندی اردو نہ سہی کم سے کم مراٹھی یا سنسکرت میں کچھ کہتا لیکن میری سب امیدیں رائیگاں گئیں''

پھر آگے فرمایا کہ انگریزوں کو ہم گالیاں دیتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے۔لیکن انگریزی کے تو ہم خود ہی غلام بن گئے ہیں۔''(۴)

گاندھی جی ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ کسی وقت بھی کسی موقع سے کوئی بھی ہندوستانی انگریزی نہیں بلکہ قومی زبان یعنی ہندوستانی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں اور اسے عام کریں، اس لئے وہ کہتے تھے کہ ''جب تک آپ لوگ اردو ہندی دونوں کے خاص عالم نہیں بن جاتے تب تک قومی زبان کی سچی سیوا نہیں کر سکتے۔'' یہ بات مہاتما گاندھی جی ایک بار نہیں بلکہ بار بار کہتے تھے۔اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہندو بھائیوں کو فارسی و اردو کے الفاظ اور مسلمان بھائیوں کو سنسکرت کے مشکل الفاظ کو سیکھنا چاہئے۔

جب کبھی بھی زبان کے تعلق سے بات ہوتی اور مہاتما گاندھی کو اپنی رائے دینی ہوتی تو وہ اکثر ہندوستانی زبان کہتے، ہندی یا اردو ذکر کرتے تو کہتے کہ یہ دونوں زبان بہت اہم ہے اسے ہر ایک کو سیکھنی چاہئے۔

دراصل گاندھی جی ہندوستان کے دو بڑی قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہ رہے تھے کیونکہ وہ بہت بڑے نباض تھے۔ وہ بھانپ چکے تھے کہ جب تک اس ملک کی دو بڑی قوم یعنی ہندو مسلم کو ایک ساتھ نہیں لایا گیا تب تک آزادئ ہند کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے ہر وقت یہ چاہا۔ ملاحظہ ہوں خود ان کی زبانی۔

''میرے نزدیک ملک کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہے جسے حل کرنا ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ مجھے اس مصیبت زدہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائیدار قلبی اتحاد نہ ہو ہمیں۔اس کا پورا احساس ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھا کہ بغیر اس اتحاد کے ہم اپنی آزادی ہرگز نہیں حاصل کر سکتے۔''(۵)

گاندھی جی اتحاد بین المذاہب کے قائل تھے اس لئے انہیں بہت سارے اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔لیکن یہ اکثر جواب نہیں دیتے اگر دیتے بھی تو بہت ہی مثبت جواب ہوتا۔

مہاتما جی ایسے شخص تھے جنہیں تعلیم و تعلم کا بڑا شوق تھا، وہ جہاں جاتے وہاں کی زبان و مذہب کے بارے میں ضرور جانتے اور وہاں کے لوگوں سے اس طرح گھل مل جاتے کہ اجنبیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

جب یہ افریقہ گئے تو وہاں بھی ''ٹال'' میں ہندوستانیوں کی ایک سیاسی جماعت بنائی۔لیکن ان کی ایک خاصیت یہ تھی کہ یہ اپنا سارا وقت سیاست میں ہی صرف نہیں کرتے بلکہ اپنے ذوق کے مطابق کچھ وقت

درس و تدریس میں لگاتے۔ یوسف ناظم نے ان کے افریقہ میں قیام کے دوران احوال کو قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''گاندھی جی نے اپنا وقت صرف سیاست میں نہیں گزارا۔ انہوں نے وہاں رہ کر کئی زبانیں سیکھی۔ وہ اردو بھی جانتے تھے اور تامل بھی، کچھ لوگوں کو انہوں نے انگریزی بھی پڑھائی اور وہاں کے کرسچین لوگوں سے ان کے مذہب کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں، انہوں نے انجیل بھی پڑھی اور قرآن بھی پڑھا، خود ہندو مذہب کے بارے میں کتابیں انہوں نے افریقہ میں ہی پڑھیں۔''(۶)

بھارت کے اس عظیم سپوت کو اپنے ملک ہندوستان کے بچوں کی بڑی فکر تھی، اس لئے انہوں نے افریقہ ہی میں ایک خاکہ تیار کیا کہ ہم اپنے دیس میں وہ کونسا تعلیمی نظام نافذ کریں جس سے ہمارے بچوں کا مستقبل روشن ہو، چنانچہ اسی وقت انہوں نے اس پر کئی مضامین لکھے۔ اس بنیاد پر ماہرین تعلیم نے اس کا نام ''بنیادی قومی تعلیم'' رکھا۔ ان کا تعلیمی فارمولا تین R۔اور تین H پر منحصر ہے۔

یعنی لکھنا، پڑھنا اور دستکاری۔ اور وہ تعلیم جو جسم، ذہن اور روح کی بہترین صلاحیتوں کو ابھارتی ہے۔ گاندھی جی کی کتاب ''ہند سوراج'' میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

Gandhiji transformed the education of 3R (Reading writing and arthmetfic(into 3H (h a n d head and heart(and said that the funcation of education is not to teach how to read, write and calculate. but to develop his hand brain and heart too.

تعلیم سے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا۔ جس پر بہت لمبی چوڑی بحث بھی ہوئی۔ مہاتما جی جو چیز بولتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے، چنانچہ اس کا ایک نمونہ انہوں نے اپنے آشرم میں پیش کیا، اس آشرم میں بلا تفریق مذہب وملت ہر کس وناکس کو رہنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہاں رہنے کے لئے کچھ وعدہ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کسی سے نہیں ڈرے گا۔ جھوٹ نہیں بولے گا، چوری نہیں کریگا۔ نشہ کی چیز کو نہیں چھوئے گا۔ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے گا، چھوت چھات کو دور کرے گا،

تعلیم سے متعلق ان کا یہ نظریہ تھا۔ جس پر بہت لمبی چوڑی بحث بھی ہوئی۔ مہاتما جی جو چیز بولتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے، چنانچہ اس کا ایک نمونہ انہوں نے اپنے آشرم میں پیش کیا، اس آشرم میں بلا تفریق مذہب وملت ہر کس و ناکس کو رہنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہاں رہنے کے لئے کچھ وعدہ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کسی سے نہیں ڈرے گا۔ جھوٹ نہیں بولے گا، چوری نہیں کریگا۔ نشہ کی چیز کو نہیں چھوئے گا۔ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے گا، چھوت چھات کو دور کرے گا، بدیسی چیزوں کو چھوڑ کر صرف کھدر پہنے گا، اور سوت کاتے گا، اور اپنے ملک کی خدمت میں لگا رہے گا، نیز گھر کا سارا کام خود سے کرے گا وغیرہ۔

بدیسی چیزوں کو چھوڑ کر صرف کھدر پہنے گا، اور سوت کاتے گا، اور اپنے ملک کی خدمت میں لگا رہے گا، نیز گھر کا سارا کام خود سے کرے گا وغیرہ۔

در اصل وہ ایک مثال پیش کرنا چاہتے تھے، زبان و بیان اور عمل کے ذریعہ اتفاق واتحاد کا اعلیٰ نمونہ دیکھانا چاہتے تھے، اس لئے تو باپو نے ایک مرتبہ یہاں تک کہہ دیا کہ ''میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی سمینٹ بننا چاہتا ہوں۔''

البرٹ آنسٹائن نے کہا ''آنے والی نسلیں بمشکل یقین کریں گی کہ ایسا آدمی بھی دنیا میں پیدا ہوا تھا۔

اور رابندر ناتھ ٹیگور نے ''مہاتما'' کے لقب سے نوازا، نیز یوسف ناظم نے کہا سچائی کا وہ چراغ جو دکھن افریقہ میں روشن ہوا ہندوستان میں سورج بن کر چمکا۔''

الغرض دیش پتا، قوم کے باپو اور دنیا کے مہان نیتا نے زبان و بیان، عادت واخلاق کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا، ہندوستان میں زبان سے متعلق اختلافات کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی اور انگریزی کے جید عالم ہونے کے باوجود ہندوستانی زبان کو ہمیشہ ترجیح دیا اور لوگوں کے دھیان کو بھی ادھر مرکوز کیا۔ نیز بنیادی قومی تعلیم اور مادری زبان میں تعلیم کا نظریہ پیش کیا۔ مہاتما جی ہی وہ مہان شخصیت ہیں جنہوں نے اس نازک وقت میں بھی زبان سے متعلق کھل کر بحث کی اور لوگوں کو ترغیب دی کہ ہمارے ملک کی زبان ''ہندوستانی'' ہے۔ جو ہندی اور اردو دونوں کے خمیر سے تیار شدہ ہے۔

لشکر گاندھی کو ہتھیاروں کو کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہئے
اکبرالہ آبادی

حوالہ جات

۱۔ گاندھی اور زبان کا مسئلہ، صفحہ ۷۰، عشرت علی ،اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ
۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۳
۳۔ ایضاً، صفحہ ۷۱
۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۳
۵۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر سید عابد حسین صفحہ ۷۰، پروفیسر صغری مہدی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی
۶۔ گاندھی جی دکھن افریقہ میں، صفحہ ۱۴، یوسف ناظم، مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی

❑❑❑

ڈاکٹر منور حسین کمال
بیت الراضیہ، G-5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی
رابطہ: 9873819521

گاندھی جی کی صحافتی خدمات اور اس کے سیاسی مضمرات

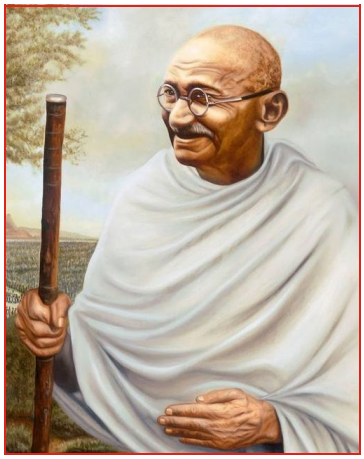

دنیا کی عظیم شخصیتوں میں مہاتما گاندھی بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عزم اور حوصلے سے لوگوں کی خدمت کر کے ظلم کے خلاف آواز بلند کر کے تاریخ میں یہ نام کمایا ہے۔ وہ بہ حیثیت ایک صحافی بھی اپنی خصوصی شناخت نہیں رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو سنوارنے میں بہت جدوجہد کی۔ وہ حق و انصاف کے لیے زندگی بھر لڑتے رہے۔ انسانی برابری اور مساوات کے لیے ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے قول و فعل، مضبوط عزائم کے ساتھ ہمیشہ اصولوں کی پابندی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے ملکوں کو بھی غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی راہ دکھائی ہے۔ انھوں نے اپنے اخبار 'ینگ انڈیا' اور 'ہریجن سیوک' کے ذریعے پوری دنیا کو امن کا پیغام دیا۔ ان کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

گاندھی جی کا مسلک تھا 'سردھرم سمبھاؤ'، یعنی تمام مذہبوں کو پھلنے پھولنے کی آزادی، اس کو جیو اور جینے دو کے اصول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، جب ہم گاندھی جی کے مضامین اور ان کی تقریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے ذات، مذہب، علاقائیت، رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ قومی ایکتا کا یہی وہ بنیادی نظریہ تھا، جس پر چل کر انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ وہ ایک خوش حال قوم کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

گاندھی جی کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ ہندوستان کو اس وقت تک آزادی نہیں مل سکتی جب تک کہ یہاں رہنے اور بسنے والے لوگ باہم مل جل کر رہنا نہیں سیکھ لیتے۔ اسی لیے گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ ان کا خیال بالکل درست تھا کہ اگر ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان امن و بھائی چارے کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھ لیتی ہیں تو اس کا ملک کی آزادی میں بہت بڑا رول ہوگا ورنہ ملک کا وجود مٹ جائے گا۔ وہ ہر صبح مختلف مذاہب کی کتابوں اور دنیا کے قابل ذکر دانشوروں کے افکار و نظریات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی کتاب 'مائی ایکسپیرئنس یمن وِدٹروتھ' میں اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران انھوں نے کئی مسلمانوں سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے میں مدد لی۔

گاندھی جی نے سچائی کی اپنی تلاش کے دوران بہت پہلے ذات پات کے نظام میں پائی جانے والی ناانصافیوں، محرومیوں اور مظالم کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ان تمام پریشانیوں کا شکار سماج کے نچلے طبقے کے وہ لوگ تھے، جنھیں عام طور پر اچھوت کہا جاتا تھا۔ یہ بدقسمت لوگ صدیوں سے ہرگاؤں کی سرحد کے باہر رہا کرتے تھے۔ وہ حقیر اور کم تر کام انجام دیتے تھے اور لوگوں کے بچے کھچے پر گزارہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ہمیشہ کمزوروں اور محروم طبقات کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کی مخالفت کی۔

گاندھی جی صحافت کی طاقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اخبار ایک ایسا ذریعہ ہے، جس کے ذریعے ہر ضروری بات عام آدمی تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ بھلے ہی آج لیکٹرانک میڈیا کا بول بالا ہو، لیکن اخبارات کی جو قدر واہمیت اس دور میں تھی، آج بھی بلاشبہ کسی طور کم نہیں ہے۔ بس اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کا فن آنا چاہیے۔ گاندھی جی کو دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی بڑی محبت تھی۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط بہت سی لائبریریوں اور آرکیالوجی میں محفوظ ہیں، گاندھی جی نے جہاں گجراتی، انگریزی اور ہندی میں اخبارات نکالے، وہیں اردو میں بھی اخبار نکالا، اس اخبار کا نام 'ہریجن سیوک' تھا۔ یہ اخبار ہفتہ روزہ تھا۔ نوجیون پریس کے ٹرسٹی اور سربراہ کپل راول کے مطابق گاندھی جی جنوبی افریقہ سے جب لوٹے تو انھوں نے مشاہدہ کیا کہ برصغیر ہند کے باشندوں کو اخبارات و دیگر ذرائع کے تعلق سے معلومات نہیں ہے۔ اس وقت گاندھی جی نے لوگوں کو انگریزوں کے چنگل سے نکالنے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اخبار نکالنا شروع کیا۔

'ہریجن سیوک' کا پہلا شمارہ 5/مئی 1946 بروز اتوار کالوپور احمد آباد میں قائم 'نوجیون پریس' سے جاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس کی قیمت دو آنہ تھی۔ اس کی تائید غلام محمد انصاری کے مضمون 'گجرات میں اردو صحافت 1947 کے بعد: ایک جائزہ' سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ گاندھی جی پر بہ طور اردو صحافی کوئی مضبوط کام نظر نہیں آتا۔ اور 'ہریجن سیوک' کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا۔

گاندھی جی اخبار اور صحافت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اسی لیے اس دور کے سرکردہ صحافیوں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ برصغیر کی آزادی کی لڑائی انھوں نے ان سب کے ساتھ مل کر لڑی۔ ابوالکلام آزاد جہاں 'الہلال' اور 'البلاغ' کی البیلی نثر کے سبب صحافت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، وہیں The Comrade اور روزنامہ 'ہمدرد' کے لیے محمد علی جوہر کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ اسی طرح ظفر علی خاں مدیر 'زمیندار' بھی اپنی خصوصی شناخت رکھتے ہیں۔ موخرالذکر دونوں صحافیوں نے آزادی کے لیے قوم میں ایسا جوش وولولہ بھر دیا تھا کہ جس نے آگے چل کر آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان کی اہم خدمات میں ان کی کتاب 'اروگیہ دگ درش' کا بھی بہت اہم رول رہا ہے۔ یہ ایک ٹیکسٹ بک تھی، جس کو صوبہ جات متحدہ کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے سرکاری وغیر سرکاری اسکولوں اور مدارس کے مطالعہ کے لیے اپنے اجلاس منعقدہ یکم دسمبر 1926 کو ایک خاص ریزولیوشن میں منظور کیا تھا۔ یہ کتاب نرائن دت اینڈ سنز لاہور نے شائع کی تھی۔ یہ کتاب دراصل پہلے گجراتی زبان میں لکھی گئی تھی۔ پھر اس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں اسکولی بچوں سے متعلق معلوماتی مضامین ہیں جن کے عناوین 'تندرستی'، 'ہمارا جسم'، 'ہوا'، 'پانی'، 'خوارک'، 'ورزش'، 'پوشاک'، 'مرد عورت کا تعلق'، 'پانی کا علاج'، 'مٹی کے ذریعہ علاج'، 'بخار اور اس کا علاج'، 'قبض'، 'سنگرہنی'، 'اسہال'، 'بواسیر'، 'چھوت کی دیگر بیماریاں'، 'بچوں کی پیدائش' اور ڈوبنا، جلنا، سانپ کا کاٹنا اور بچھو وغیرہ کے ڈنک قابل ذکر ہیں۔

گاندھی جی نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

''تقریباً بیس سال سے میں مضمون صحت کی اہمیت پر غور کرتا رہا ہوں۔ چند ذاتی اصولوں کی پابندی کی وجہ سے ولایت میں رہتے وقت کھانے پینے کا سب انتظام اپنے ہاتھ ہی سے کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت مجھے جو تجربے ہوئے ان سے میں نے کئی نتائج اخذ کیے، جن کا ناظرین [کی دلچسپی اور فائدے کی خاطر کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انگریزی میں مثل مشہور ہے 'علاج سے پرہیز بہتر ہے' یعنی بیماری کو رفع دفع کرنے کی نسبت اسے پیدا ہی نہ ہونے دینا بہتر ہے۔ ہماری کہاوت 'پانی سے پہلے پل باندھا جائے' بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔ مرض نہ ہونے دینے کی ترکیبوں سے استعمال کو انگریزی میں 'ہائی جین' کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں اسے 'حفظ صحت وما تقدم' کہتے ہیں۔''

گاندھی جی نے درج بالا عناوین سے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اپنی صحت کے تئیں بیدار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ سمترا گاندھی کلکرنی بنت رام داس جو گاندھی جی کی پوتی ہیں، وہ آئی اے ایس افسر ہیں اور راجیہ سبھا میں گجرات کی نمائندگی کرتی تھیں، ایک جگہ ان کے حوالے سے لکھا ہے:

گاندھی جی یکسوئی کا فن جانتے تھے۔ ان میں استقلال تھا، وہ شور شرابے سے بھری بھیڑ میں بھی سو سکتے تھے۔ سب سے اہم یہ کہ حالات چاہے جیسے ہوں، غلط کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے آپ کو ایک بار صحیح راستے پر چلنے کے لیے تیار کرو تو پھر دباؤ ڈالنے والی قوتیں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ معاشرے کے ان لوگوں کی مدد کریں جو ضرورت مند ہیں.....بس اتنا سوچیں

کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب یہ اس پر ہے کہ وہ اپنا فرض نبھائے یا نہ نبھائے۔''

گاندھی جی کا مضمون Great Sentinel (عظیم سنتری) ان کے لیے بڑی شہرت کا سبب بنا۔ یہ مضمون انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ آزادی سے قبل جو ملک کے حالات تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس دوران گاندھی جی نے اپنی دلی خواہش کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''میں دل سے چاہتا ہوں کہ یہ گیت کار اور اس کے عہد کے سبھی دوسرے لوگ چرخا چلائیں۔ جب لڑائی چھڑ جاتی ہے گیت کار بانسری کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ وکیل اپنی رپورٹ کو ایک طرف کر دیتا ہے اور طالب علم اپنی کتابوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی اس وقت کرتا ہے جب جنگ کو فتح کر لیا جاتا ہے..... جب میرے چاروں طرف لوگ خوراک کی کمی کے باعث دم توڑ رہے ہیں، محض ایک ہی بات جس کی اجازت مجھے میرا ضمیر دیتا ہے، وہ ہے بھوکوں کا پیٹ بھرنا..... ہمارا ہندوستان محض شہروں میں ہی نہیں رہتا، ہندوستان ہمارے ساڑھے سات لاکھ گاؤں میں بستا ہے۔''

بہ حیثیت ایک صحافی گاندھی جی نے پورے برصغیر کا جائزہ لیا تھا اور وہ ملک کے غریب کسانوں، محنت کشوں اور مزدوروں کا درد سمجھتے تھے، اسی لیے ان کا خیال تھا کہ شاعر اپنی شاعری چھوڑ دیں اور جو بڑے عہدوں پر فائز افراد ہیں، وہ اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور برصغیر ہند کے محروم طبقات کی مدد کے لیے آگے آئیں۔

گاندھی جی نے اچھوتوں کا نام بدل کر انھیں ہریجن بلانا شروع کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ہریجن کے معنی بھگوان کی اولاد کے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اچھوتوں کی آزادی کو بھی ایک ضروری عنصر قرار دیا تھا۔ انھوں نے اپنی اس تحریک کی وضاحت اس طرح کی تھی: ہریجن کا مطلب ہے ایشور کی اولاد، دنیا کے تمام مذاہب میں برابری کا سبق دیا گیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اچھوتوں کو ان کا حق دلانے کے لیے آواز بلند کی۔ جب احمد آباد شہر کے باہر انھوں نے اپنا پہلا آشرم قائم کیا تو اس کا نام 'ہریجن بھون' رکھا۔

ملک کی آزادی کی جدوجہد کے آغاز پر ہی گاندھی جی نے اعلان کیا تھا کہ جب تک خواتین عوامی زندگی کا ایک حصہ نہیں بنتیں ہم شاید سوراج حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہمیں آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو میرے نزدیک اس سوراج کی کوئی اہمیت اس لیے نہیں رہے گی کہ خواتین کو ان کا جائز حصہ پوری طرح نہیں دیا گیا ہے۔

گاندھی جی کی حب الوطنی اور قوم پرستی کی بنیاد ان کے شعور کے پھیلاؤ پر تھی۔ وہ ہندوستان کی ایک قدیم کہاوت کا حقیقی مظہر تھے، جس میں کہا گیا ہے کہ تمام فراخ دل انسانوں کے لیے ساری انسانیت ایک خاندان جیسی ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان ایک تہذیب کا نام تھا جس کی اپنی خصوصی رومانی شناخت ہے اور جو انسانیت کے لیے اپنا خصوصی حصہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا:

''میں ہندوستان کی آزادی کے لیے جیتا ہوں اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ہی مروں گا۔ لیکن میری حب الوطنی میں کسی کو الگ تھلگ رکھنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کا مقصد سبھی قوموں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ ہندوستان کی نجات کے ذریعے میں ساری دنیا کی کمزور ترین نسلوں کو بھی نجات دلانا چاہتا ہوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ حب الوطنی بھی انسانیت کا ہی نام ہے اور حب الوطنی الگ تھلگ کوئی شے نہیں ہے۔ میں اس لیے محب وطن ہوں کہ میں انسان ہوں اور انسانیت کا حاصل بھی۔ ہندوستان کی خدمت کرنے کے لیے میں کبھی برطانیہ یا جرمنی کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔

گاندھی جی سے آج دنیا کا ہر چھوٹا بڑا کیا بچہ بچہ واقف ہے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور بڑے بڑے کارناموں نے انھیں بابائے قوم اور مہاتما جیسے القاب عطا کیے۔ عام آدمی کے ذہن میں ان کا پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ وہ بے سروساماں ایک درویش ہوں گے جنھوں نے اپنے خصوصی نظریہ، عدم تشدد کی بنیاد پر جنگ آزادی کا صور پھونکا اور ہندوستان میں قدم جما چکے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ان کی زندگی کا انقلابی پہلو ہے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کو بہت دکھ دیے، لیکن تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ایک بڑا دکھ اور ہے جس کا تذکرہ کم ہی کیا جاتا ہے اور وہ ہے ہندوستانی زبان کی تقسیم۔ انیسویں صدی میں ہی ہندو-مسلم کے درمیان نفرت پھیلانے کے لیے انھوں نے زبان کا سہارا لیا اور ہندی- اردو زبان کی تقسیم کر دی۔ جو دراصل ہندوستانی زبان یا ہندوی زبان کہلاتی تھی۔ جس کے نتیجے میں ہندو ہندی کو اپنی زبان اور مسلمان اردو کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔

برصغیر ہند میں اگر ہندوستانی لسانیات کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو 1835 کے بعد کے دور میں ہندی کا چلن عام ہو گیا تھا..... اور 1857 کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی سامراج نے اس کو فروغ دیا تاکہ شیر و شکر کی طرح رہنے والی ہندوستان کی دو بڑی قومیں آپس میں الجھ جائیں۔ گاندھی جی نے برطانوی سامراج کی اس سازش کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ انھوں نے ہندوستانی زبان کی ترقی و بقا اور اشاعت و ترویج کے لیے بھی بڑی کوششیں کیں۔ گاندھی جی کا ماننا تھا کہ ہندوستانی زبان ہندی- اردو کا ایسا حسین سنگم ہے جو گنگا، جمنا، سرسوتی سے بھی عظیم ہے۔ گاندھی جی کو ہندوستان کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے ایسی

ہندوستانی زبان کی وکالت کی، جو اصلاً اردو ہی تھی۔
پروفیسر محمد مجیب نے لکھا ہے:

''گاندھی جی کی آرزو تھی کہ ہندوستان کی ایک زبان ہو، 'ہندی یعنی ہندوستانی' جسے دیوناگری اور اردو لپیوں (رسم خط) میں لکھا جائے۔ ہم نے زبان کو ایک سیاسی مسئلہ بن جانے دیا۔ ہندوستانی بولتے رہے، اسے پسند کرتے رہے مگر اسے سیکھنا، سکھانا بند کر دیا۔ ادھر ہندی کو جنتا کی زبان کہتے رہے اور اسے اتنا مشکل بنا دیا کہ وہ جنتا کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

بعض ناسازگار حالات کے سبب جب 'ہری جن سیوک' کو بند کرنے کی نوبت آئی تو گاندھی جی نے اردو ایڈیشن کے ساتھ ہندی ایڈیشن بھی بند کر دیا۔ جب اس سلسلے میں ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا:

''مجھے اس بات کی وضاحت کرنے دیجیے کہ میں نے کیوں دونوں ایڈیشنوں کو بند کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ جب ناگری 'نوجیون' اور دیوناگری 'ہری جن سیوک' شائع ہونا شروع ہوئے تو دونوں رسم خطوں کا کوئی تنازع نہیں تھا اور اگر رہا بھی تو کم از کم میرے علم میں نہیں۔ دریں اثنا مرحوم سیٹھ جمنا لال بجاج کی ایما پر 'ہندوستانی پرچار سبھا' کا قیام عمل میں آیا۔ اس بار اردو ایڈیشن نکالنا بے حد ضروری ہو گیا۔ اب اگر میں اردو ایڈیشن بند کر دیتا اور صرف دیوناگری ایڈیشن جاری رکھتا تو یہ خود میری نظروں میں انتہائی غیر معمولی امر ہوتا۔

(ہماری زبان انجمن ترقی اردو (ہند) 15/ جون 1978ء، گوپال متل بہ شکریہ رسالہ تحریک نئی دہلی)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ دونوں زبانوں سے یکساں محبت رکھتے تھے۔ اگر انھیں کسی وجہ سے 'ہری جن سیوک' اردو کو بند کرنا پڑا تو انھوں نے اس کے ہندی ایڈیشن کو بھی بند کر دیا۔ اس تنازع سے بچنے کے لیے ہی وہ 'ہندوستانی' نام کے موید تھے لیکن انھیں اس ضمن میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی..... اور ان کے نہ چاہنے کے باوجود ہندی زبان ہندوستان کی قومی زبان قرار پائی۔

ہندوستان کے مستقبل کا جو خاکہ ان کے ذہن میں تھا، وہ اس خاکہ کو لفظوں کا جامہ پہنا کر لوگوں کی رگوں میں حرارت پیدا کرنا چاہتے تھے..... اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے بی گاندھی جی کی زندگی کا سب سے اہم مقصد محروم طبقات کو اوپر اٹھانا تھا، جس کے لیے وہ تاعمر کوششیں کرتے رہے۔ ان کے یہاں قوموں کی کوئی تفریق نہ تھی۔ غریب چاہے

''غریب سے غریب لوگ بھی محسوس کریں کہ یہ ان کا اپنا ہندوستان ہے، جس کی تعمیر میں ان کی پر اثر آواز شامل ہو، ایک ایسا ہندوستان جس میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو، جس میں تمام طبقوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہیں۔ ایسے ہندوستان میں چھوت چھات کے لیے کوئی جگہ نہ ہو..... اور نہ نشہ آور دواؤں کے لیے اس میں کوئی جگہ ہو..... اور عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں، جو مردوں کو ہیں۔''

برہمن ہو یا مسلمان، دلت ہو یا اور کسی پسماندہ برادری سے تعلق رکھتا ہو، وہ بھوکا نہ رہے۔ وہ صرف اسی چیز کو ضروری سمجھتے تھے جو عوام کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''غریب سے غریب لوگ بھی محسوس کریں کہ یہ ان کا اپنا ہندوستان ہے، جس کی تعمیر میں ان کی پر اثر آواز شامل ہو، ایک ایسا ہندوستان جس میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو، جس میں تمام طبقوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہیں۔ ایسے ہندوستان میں چھوت چھات کے لیے کوئی جگہ نہ ہو..... اور نہ نشہ آور دواؤں کے لیے اس میں کوئی جگہ ہو..... اور عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں، جو مردوں کو ہیں۔''

گاندھی جی کی ایک اہم تصنیف 'میری ستیہ سادھنا' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر جوانی، سفر افریقہ، وہاں سے واپسی پر وکالت کا آغاز، ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد سمیت اپنی ذاتی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ بچوں کو تعلیم دینے کا طریقہ، اپنا برہم چریہ وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے..... چھوت چھات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے، ہندو-مسلم اتحاد کے لیے کی گئی اپنی کوششیں اور برطانوی حکومت کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر گفتگو کی ہے اور آخر میں اپنے عظیم خیالات کا بایں الفاظ اظہار کیا ہے:

.....لیکن بغیر روحانی پوترتا کے کوئی بھی ہر جاندار کو سینے سے نہیں لگا سکتا۔ بغیر روحانی عظمت کے اہنسا کا اصول ایک بنیادی سپنا ہی رہے گا۔ مالک دوجہاں کے دیدار کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتے، جس کی روح پاک نہ ہو..... اپنے نفس پر قابو پا کر ہی انسان اہنسا کے راستے پر چل سکتا ہے۔

گاندھی جی کو لکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ گاندھی جی کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک 'ہند سوراج' بھی بہت اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب 1959 میں گجراتی زبان میں شائع ہوئی۔ لیکن دیگر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ یہ بات بڑے وثوق اور یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ قلم کے ایک ایسے سپاہی تھے جو ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ مضامین لکھنا، مختلف اخبارات کے مدیروں کو خطوط لکھنا ان کی یومیہ سرگرمیوں کا حصہ تھا۔ ان کی تمام کتابیں حکومت نے 1960 کی دہائی میں چھپوائی تھیں۔ ان کے کل صفحات پچاس ہزار ہیں اور انھیں 100 جلدوں میں جمع کیا گیا ہے۔

❑❑❑

عمیر منظر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
رابطہ: 8004050865

گاندھی جی اور ان کی سیاسی محاذ آرائی

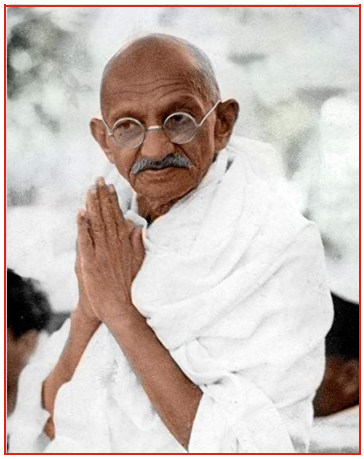

خطۂ اعظم گڑھ اپنی علمی و ادبی بصیرتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کا بھی مرکز رہا ہے۔ ۱۸۵۷ کی ناکام جنگ آزادی سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں نے شجاعت و جواں مردی کا نہ صرف مظاہرہ کیا، بلکہ ملک مخالف طاقتوں سے اپنی سیاسی بصیرت کا اعتراف بھی کرایا۔ سیاسی بیداری کی وجہ سے یہ علاقہ تحریک آزادی کے مجاہدین کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔

۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں کی اس علاقے پر خاص نگاہ تھی۔ ۱۹۱۷ میں جب رولٹ ایکٹ کا نفاذ برطانوی حکومت نے کیا تو پورے ملک میں اس کے خلاف زبردست ردعمل ہوا۔ اعظم گڑھ اور مضافات کے بہت سے علاقے اس تحریک میں شامل ہوئے۔

ستمبر ۱۹۲۱ میں جب ولایتی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا گیا تو ہندو مسلم سب ایک پلیٹ فارم پر آ گئے اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں باغیانہ تقریروں نے ان کے جذبات کو اور بھی برانگیختہ کر دیا۔ گاندھی جی نے اس وقت عوامی قیادت کے خلا کو نہ صرف پر کیا بلکہ وہ ایک زبردست عوامی قائد کے طور پر سامنے آئے اور جدوجہد آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ ہی ان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ مہاتما گاندھی بن گئے۔ انگریز ان کو دیکھ کر خوف کھاتے تھے۔

ولایتی کپڑوں کے بائیکاٹ کی تحریک کوئی معمولی سیاسی فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس کے دوررس اثرات ہوئے۔ اس اہم فیصلہ کی تائید میں اعظم گڑھ اور اطراف کے لوگوں نے غیر ملکی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ مبارک پور اور مئو یہ دو ایسے قصبے تھے جو سوتی کپڑوں کی صنعت کے بڑے مراکز تھے۔ بائیکاٹ کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کے باوجود تحریک آزادی کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ یہی زمانہ ہے جب کانگریس کمیٹی اور خلافت کمیٹی کے اہم سربراہان کا سفر اعظم گڑھ اور مئو کی طرف ہونے لگا۔

ان سربراہان میں مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی کھدر تحریک بھی مقبول ہوئی۔ مئو کے رضا کاروں کے بارے میں حاجی شاہ افضال اللہ قادری نے لکھا ہے:

''قصبہ مئو کے رضا کار سفید کھدر کی وردی، گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے پریڈ اور مارچ کرتے تھے، ڈرل ماسٹر بجائے انگریزی اصطلاحات کی'' چپ بروراست برو'' کہتے تھے۔

(تاریخ اعظم گڑھ، ص ۶۲)

انھوں اعظم گڑھ کی ایک پولیٹکل کانفرنس کا حال بھی لکھا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کانفرنس ہوتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

شہر اعظم گڑھ میں کے کربلا میدان میں ہر سال ضلع پولیٹکل کانفرنس منعقد ہوتی تھی۔ اس کانفرنس کا نہایت شاندار پنڈال بنتا تھا، جو تمام تر کھدر کا ہوتا تھا، فرش وشامیانہ سب اسی کا ہوتا تھا، پنڈال میں گیلریاں بھی بنائی جاتی تھیں، ہر گیلری پر تختی آویزاں رہتی تھی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی اور نگراں مولانا مسعود ندوی ہوتے تھے، ان کی ہر آواز پر سارا ضلع بہ بانگ دہل لبیک کہتا تھا۔

(ایضاً ص، ۶۲)

کھدر تحریک کی یہ کانفرنس نہ صرف بہت اہم ہوتی تھی بلکہ قومی رہنماؤں کی سیاسی بیداری کی غماز تھی۔ واضح رہے کہ کھادی کو ہمارے رہنماؤں نے ہندستانی انسانیت، اقتصادی آزادی اور برابری کی علامت قرار دیا ہے۔ جواہر لال نہروں نے تو اسے آزادی کا بانا کہا ہے۔ (نیا دور لکھنؤ جنوری ۱۹۹۶) اس زمانے کے بیشتر چوٹی کے لیڈران اس کانفرنس میں آتے تھے اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو جوش و جذبے سے سرشار کرتے تھے۔ پنڈت موتی لال، پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، تصدق حسین شیروانی، ڈاکٹر سید محمود جیسے رہنمایاں آزادی شریک ہوتے تھے۔

تحریک آزادی کے دنوں میں شبلی اکیڈمی کو مرکزیت حاصل تھی۔ بلا تفریق مذہب وملت سیاسی رہنماؤں کی آمد و رفت یہاں رہتی۔ گاندھی جی اعظم گڑھ آتے تو شبلی منزل ضرور آتے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ:

''گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڑھ آئے تو ان کے قیام کا انتظام تو اور جگہ تھا مگر وہ خود شبلی منزل آئے اور ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنفین ایک کھلی جگہ پر مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے اور ساتھ آنے والوں کو باادب اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے دارالمصنفین کے کتب خانے کو لالٹین کی روشنی میں دیکھا اور جب دارالمصنفین کے ایک رفیق نے ان کے سامنے دستخط کے لیے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھوں نے اپنا دستخط اردو میں کیا۔''

(یادرفتگاں، سید صباح الدین عبدالرحمن جلد دوم، ص، ۳۳)

پورے ملک میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی، گاندھی جی کے لیے محبت وعقیدت کی ایک ایسی فضا قائم ہوگئی تھی کہ جس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ خود گاندھی جی نے دیسی سامانوں کے استعمال کی جو تحریک چلائی وہ سیاسی سطح پر بے حد کامیاب رہی۔ اس کے اثرات ملک کے دیگر خطوں کے ساتھ ساتھ اعظم گڑھ میں بھی تھے۔ چرخے کی جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگوں نے کتائی بنائی کو لازمی کر لیا تھا۔ اسی تناظر میں گاندھی جی سے متاثر ہوکر اعظم گڑھ میں بعض ایسے کام کیے گئے جو سیاسی وتعلیمی بصیرت کے غماز ہیں۔

شعیب اعظمی کے بقول:

''اسی سلسلے کی ایک کڑی تعلیمی اسکول کی تھی، جو گاندھی جی کے نام پر محلہ پہاڑ پور میں مولانا شبلی کے والد حبیب اللہ مرحوم کے مکان میں کھولا گیا، جو طلبہ اسکول چھوڑ چکے تھے یا جن کا نام اسکول سے خارج ہو چکا تھا ان کی بڑی تعداد اس اسکول میں داخل ہوئی۔ شاہ علاء الحق وکیل اس مدرسے کے اہم سرگرم کارکن اور مدرس تھے۔''

(پروانۂ چراغ مزار خودیم ما، حکیم محمد اسحاق، ص، ۵۵)

واضح رہے کہ سول نافرمانی تحریک نمک ستیہ گرہ کے زمانے میں اعظم گڑھ کے لوگوں کا تحریک کے تئیں جذبہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ۱۳، اگست ۱۹۲۹ء کو گاندھی جی اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔ حاجی شاہ افضال اللہ قادری کے بقول:

''شری کرشن پاٹھ شالہ، چھترپا کالج کے وسیع میدان میں اور بہت بڑے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی تھی۔ ٹھاکر سورج ناتھ سنگھ ایڈوکیٹ، سیتا رام استھانہ وکیل، مولانا مسعود علی ندوی ان کو دوہری گھاٹ تک پہنچانے لے گئے تھے۔''

(تاریخ اعظم گڑھ، ص، ۶۳)

شاہ معین الدین احمد ندوی نے حیات سلیمان میں لکھا ہے کہ:

''ناگپور کانگریس کے بعد پورا ہندوستان ترک مولات کی تحریک سے گونج رہا تھا اور یوپی میں اعظم گڑھ اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔''

(حیات سلیمان، ۲۰۱۱، ص ۱۸۵)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس ۱۹۲۱ میں احمد آباد گجرات میں ہوا تھا، جس میں سید سلیمان ندوی بھی شریک تھے، اس اجلاس میں انھیں ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا اس کے بارے میں خود سید سلیمان نے لکھا ہے کہ:

''کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دس ممبروں میں ایک میرا انتخاب ہوا۔ بڑے بڑے مدعیان سیاست اور ارباب عمائم اس عزت کے حصول کے

لیے دوڑ دھوپ کررہے تھے...آپ سن کر خوش ہوں گے کہ گاندھی جی نے میرے متعلق بڑی اچھی رائے لوگوں سے ظاہر کی ہے۔''

(حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص، ۱۸۵)

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قومی بیداری میں خطۂ اعظم گڑھ گاندھی جی سے کس قدر قریب تھا۔ گاندھی جی کا شبلی اکیڈمی اور خطۂ اعظم گڑھ سے والہانہ تعلق کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر سید سلیمان ندوی کو بھیجا تھا۔ انھوں نے اردو میں یہ خط ۱۳ فروری ۱۹۴۵ء کو لکھا تھا۔ یہ خط دراصل مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہندوستانی پرچار سبھا کی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ہے۔ گاندھی جی کے خط کی عبارت ہے۔

''بھائی صاحب:

۲۷۔۲۶ فروری کو ہندوستانی پرچار سبھا کی کانفرنس ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں اور اس سوال کے سلجھانے میں حصہ لیں۔ مجھے آشا ہے کہ آپ ضرور آویں گے۔ آنے کی تاریخ اور وقت سے خبر دیں گے۔

آپ کا

موہن گاندھی

بنام: مولانا سید سلیمان ندوی

شبلی منزل اعظم گڑھ

گاندھی جی نے ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق جس طرح سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ خود سید سلیمان ندوی گاندھی جی کے نظریۂ 'ہندوستانی' کے حامی تھے۔ اس کے پیچھے جو مقصد کارفرما تھا، وہ ہندوستانیوں کو بغیر کسی بھید بھاؤ کے ایک پلیٹ فارم پر لانا تھا۔ چونکہ انگریزوں نے کو یہ بات قطعی طور پر قابل قبول نہیں تھی۔ اسی لیے انگریزوں نے تشدد سے ڈر پیدا کرکے اپنی حکومت قائم رکھنا چاہتے تھے اور گاندھی جی عدم تشدد کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرکے انگریزوں سے ملک آزاد کرانا چاہتے تھے۔ یہی وہ بنیادی فرق تھا، جس میں انگریزوں کی شکست اور آسان ہوگئی۔ اور گاندھی جی دیکھتے دیکھتے امن و انسانیت کے ایک علم بردار بن کر سامنے آئے۔

گاندھی جی نے جو کچھ کیا، جو کچھ کہا، اس پر ہندوستانی عوام نے اپنا پورا تعاون پیش کیا، اس میں کسی علاقے کو بطور خاص نہیں، بلکہ سب خواص کے زمرے میں آتے ہیں۔ قومیت کا تصور گاندھی جی کے نزدیک بالکل واضح تھا۔ لیکن بعض علاقے وہ ہیں جن کو بیدار کرنے میں گاندھی جی غیر معمولی کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی دراصل انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی فتح کی صورت میں دیکھی جانی چاہیے۔ ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگوں نے اس میں اپنا بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔

اعظم گڑھ میں گاندھی جی کا جانا یقینا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن ان کی اس آمد کو ہم قومی بیداری سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ کیونکہ انگریزوں کی بعض پالیسی سے سب سے زیادہ نقصان اعظم گڑھ اور نواح اعظم گڑھ کو اٹھانا تھا، ایسے میں لوگوں نے غلامی پر بھوک کو ترجیح دی۔

لوگوں کے اس جذبے کو گاندھی جی اور ان کے رفقا نے اور بھی پروان چڑھایا۔ تاریخ کا جب بھی مطالعہ پیش کیا جائے گا تو گاندھی جی کا دورۂ اعظم گڑھ کا ذکر بہت تزک و احتشام کے ساتھ کیا جائے گا۔ اور اس سیاسی بیداری کا بھی جو اس خطہ میں تھی۔

کتابیات

۱۔ پروانۂ چراغ مزار خودیم ما، حکیم محمد اسحاق شعیب اعظمی (مرتب) دہلی، ۱۹۷۵

۲۔ تاریخ اعظم گڑھ، حاجی شاہ افضال اللہ قادری، اعظم گڑھ ۲۰۱۱

۳۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۱

۴۔ یادرفتگاں، سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ جلد دوم ۲۰۰۹

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

ڈاکٹر محمد یٰسین
A-380، کریلی، الٰہ آباد

گاندھی جی کی قیادت اور ان کا تصور عدم تشدد

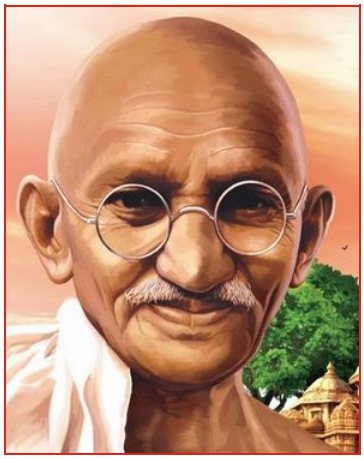

گاندھی جی کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ گاندھی جی کی پیدائش ۲ / اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بمقام پور بندر گاندھی خاندان میں ہوا اور وہیں کے ایک مدرسے میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ ان کے والد کبا گاندھی راجستھانی عدالت میں دیوان کے عہدے پر فائز تھے۔ گاندھی جی کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں کستور بابائی سے ہوئی۔ ۱۹ سال کی عمر میں وہ بیرسٹری کرنے انگلستان گئے وہاں جانے سے قبل ان کی ماں نے ان سے عہد لیا کہ انگلستان کے دوران قیام گوشت خوری، شراب نوشی اور جنسی عیاشی سے قطعی پرہیز کرنا۔

جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان ہندی نژاد تاجر کے مقدمے کی پیروی کرنے وہ جنوبی افریقہ گئے اور وہیں سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہیں سے انہوں نے ستیہ گرہ کا عدم تشدد کے ایک حربے کے طور پر استعمال شروع کیا۔ اسی وقت سے ان کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہاں مقیم تمام ہندوستانیوں کے اوپر ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔

گاندھی جی کی زبان میں بڑی خوش بیانی اور دل نشینی تھی جس کے وہ مالک تھے۔ انھوں نے عدم تشدد اور ترک موالات پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی زبان بہت سادہ تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ ان کی آواز اور ان کا چہرہ بظاہر جوش و خروش اور جذبات سے خالی نظر آتا تھا۔ لیکن ان کے اندرون میں دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا تلاطم خیز طوفان پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔ جو راستہ انھوں نے بتایا تھا وہ سخت و دشوار گزار ضرور تھا لیکن یہ ہمت والوں کا راستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ منزلِ مقصود تک ضرور پہنچا کر رہے گا۔

گاندھی جی نے ایک عالم گیر محبت کا درس دیا ان کی سوچ اور فکر و نظام اوروں اور بالخصوص مغرب سے جس میں صرف طاقت ور ہی کو پروان چڑھنے کا حق حاصل ہے ان کے یہاں کمزور سے کمزور کے لئے بھی جگہ ہے۔ وہ درماندہ ہم سفروں کو تیز رفتاری کے جنوں میں چھوڑ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقولہ ہے کہ ''زندگی دولت سے اہم ہے۔'' وہ ترقی یافتہ ہندوستان کی بنیاد، سودیشی اور سیوادھرم کو پرکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سارے معاشی اصول میں اسی معصوم جذبے کی جھلک نظر آتی ہے ان کے پاس محبت کرنے والا ایک پرخلوص دل ہے، ہمدردی اور دوستی کا بے پناہ جذبہ ان کا سرمایہ حیات ہے۔ اور دوسروں کے خلوص کی دل سے قدر کرتے ہیں:

''اپنی خواہشات پر مکمل کنٹرول انتہائی سادہ زندگی سچّائی اور صداقت کے لئے اپنے آپ کو پورے طور سے وقف کر دینا قوانین اور قاعدوں کی بلا چوں و چرا اطاعت کرنا۔مخالف کے خلاف کسی قسم کے غصّہ اور نفرت کے جذبات نہ رکھنا اور نہ سزا یا جسمانی ایذا کے ڈر سے مخالف کی کسی غلط بات کو ماننا۔حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی صورت میں اپنے کو ہنسی خوشی گرفتاری کے لئے پیش کرنا اور جائداد یا مال کی حکومت کی طرف سے ضبطی یا قرقی ہونے کی صورت میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنا۔مخالف یا دشمن کو برا بھلا نہ کہنا اور نہ گالی کو سنے دینا اور نہ اس کی توہین کرنا، اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دشمن کی جان بچانا ہے۔''(۱)

گاندھی جی کی حیثیت ایک سچّے وطن پرست کی ہے ان کی رگ رگ میں دھان کے کھیتوں کی لہلہاہٹ ان کی تری اور سبزی اور ان گنت دریاؤں اور جھیلوں کی رنگینی بھری ہوئی ہے۔انہیں اپنے ملک کی رعنائیوں کا ایک خاص احساس تھا۔لیکن وہ حقیقت سے بھاگنا نہ جانتے تھے انہیں اعتراف تھا کہ اس حسین پس منظر کے باوجود قومی زندگی کے حسین مرقعوں میں بالعموم رنگ اور شگفتگی کی کمی ہے اس کھوئی ہوئی عظمت کو جو کبھی ہماری تھی دوبارہ حاصل کرنے کے لئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ملک کے لاکھوں دیہات کو جو آج بے حسی کا شکار ہیں ایک نئی روح بخشی جائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا دماغ رسم و رواج اور قدامت پسندانہ فرسودگی میں گرفتار تھا بلکہ وہ تنگ دائروں سے نکل کر تخلیق اور حقیقت کی فطری راہوں پر گامزن ہونا چاہتے تھے وہ انسانی زندگی کو لالچ اور نفرت کی دلدل میں پھنسا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے وہ شاداب وادیوں کی طرف بڑھنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش کرتے ہیں۔وہ معاشیات کو اخلاق کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دینا چاہتے تھے گویا معاشیات اور اخلاقیات ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ان کے نزدیک تمام معاشی رشتوں کی بنیاد محبت اور ہمدردی پر ہے نفرت تو ایک تخریبی جذبہ ہے۔اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ہمیں اپنے ملک کے لئے کسی تعمیری جذبے کی بنیاد ڈالنا ہے۔ایسا جذبہ جس کے سہارے ہم آپ اور سب ہنسی خوشی زندگی گزار سکیں وہ ایسی زندگی چاہتے تھے جس میں امن اور سکون ہو نیز مذہبی و سماجی اعتبار سے عدم تشدد ہو۔ان کی ساری زندگی اسی قسم کا ایک تعمیری جذبہ ہے جو گنگا کے پانی کی طرح حسین اور شفاف ہے :

''ان کا کہنا تھا کہ ہر انسان میں فطری طور پر مذہبی جذبہ پایا جاتا ہے اور اسے پوری طرح سے ترقی دینے اور اجاگر کرنے کے لئے سچّائی اور اہنسا پر عمل کرنا از حد ضروری ہے۔بغیر اہنسا کے انسان سچّائی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔جو شخص دوسروں کے خلاف تشدّد استعمال کرتا ہے وہ سچّائی سے دور جا پڑتا ہے تشدّد دسب سے بڑا جھوٹ ہے اور سچّائی کے بالکل منافی ہے اس لئے کہ یہ زندگی کے تقدّس کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔سچّائی کے پرستار کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اہنسا کے اصولوں پر کاربند رہے۔''(۲)

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا جس سے کانگریس میں گاندھوی عہد کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔اب گاندھی جی کانگریس کے سب سے بڑے اور سب سے بااثر رہنما بن گئے تھے۔ان کی قیادت میں کانگریس پہلی بار عوام کی نمائندہ جماعت ہوگئی۔گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کی تحریک عدم تعاون کو تحریک خلافت کے ساتھ باندھ دیا۔ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان آزادی حاصل نہیں کر سکتا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہو جائیں تو آزادی ملنے میں دیر نہیں لگے گی :

''چنانچہ یہی ہوا اور ۱۹۲۲ء تک کانگریس اور خلافت کی متحدہ قیادت نے ترک موالات کی زبردست تحریک چلائی اور اس نے برطانوی حکومت کی چولیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ملک میں زبردست جوش خروش پھیل گیا۔حکومت کا سارا رعب وطنطنہ رخصت ہوگیا۔عدیم المثال ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا سرکاری افسروں اور ملازمتوں کی خاصی تعداد نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ہزاروں کی تعداد میں طالب علموں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا۔وکیلوں اور بیرسٹروں کی خاصی تعداد نے کچہریوں کا بائکاٹ کیا۔گاندھی جی اور علی برادران اس عظیم عوامی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے یہ تحریک عدم تشدّد کے اصولوں پر چلائی گئی۔حکومت کے جبر و تشدّد اور زیادتیوں کو لوگوں نے بخندہ پیشانی قبول کیا۔تین ہزار سے زیادہ افراد جیل گئے کانگریس اور خلافت کے بہت سے اہم رہنما گرفتار کئے گئے۔''(۳)

مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کا فلسفۂ عدم تشدد ایک روشن ترین منارہ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔احمد آباد میں منعقدہ کانگریس کے تاریخی اجلاس ۱۹۲۱ء میں نہ صرف عدم تشدد اور عدم تعاون کے پروگرام کو پوری مضبوطی کے ساتھ جاری رکھنے کا ارادہ کیا گیا بلکہ سول نافرمانی کی تجویز کو پاس کرنے کا فیصلہ کیا اور تحریک الاقوام کی پیغامبری کی ذمہ داری مہاتما گاندھی کے سر پر رکھ دی۔چنانچہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندوستان کی ساری قومیں متحد ہوکر عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گئیں۔اسی درمیان چوراچوری کا واقعہ پیش آیا۔جس میں شعلہ زن دیہاتیوں نے پولیس کے ظلم وستم سے تنگ آکر پولیس اسٹیشن کو آگ کے حوالے کر دیا جس میں پولیس کے کئی افراد کو اپنے جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔گاندھی جی کو اس واقعہ سے شدید چوٹ پہنچی۔انہوں نے اپنی پوری تحریک ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو نامعلوم وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔اس سے

تحریک ترک موالات ٹھنڈی پڑ گئی گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا اور انھیں چھ سال کی سزا دی گئی۔تحریک کو ملتوی کر دینے کا فیصلہ ان کے تمام ساتھیوں کو ناگوار لگا۔مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے۔لکھتے ہیں :

''چوری چورا کے حادثہ کی وجہ سے تحریک کا ملتوی ہوجانا غالباً مہاتما گاندھی کے سوا تمام نمایاں کانگریسی لیڈروں کو ناگوار ہوا۔''(۴)

اس واقعہ سے یہ پتا چلا کہ مہاتما گاندھی عدم تشدّد کو کس قدر عزیز رکھتے تھے ان کے نزدیک اس کی کیا اہمیت تھی۔ان کے اس فرمان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

''عدم تشدد میرے مذہب کا پہلا اور آخری اصول ہے۔''(۵)

ترک موالات کی بڑی تحریک سوراج حاصل کرنے میں ناکام رہی لیکن اس ناکامی کے باوجود اس تحریک کی بدولت ہندوستان کی سیاست میں آزادی کے لئے نعرے بلند ہوئے۔اس میں تیزی اور اہم دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔کانگریس عوامی،قومی نمائندہ جماعت بن گئی اور آزادی کا پیغام ملک کے کونے کونے میں پہنچ گیا۔گاندھی جی ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما بن گئے تھے۔اس تحریک کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عام ہندوستانیوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا خوف بالکل نکال دیا۔ان کے اندر خود اعتمادی،ہمّت اور بہادری پیدا کردی۔نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو اب پولیس کے ڈنڈے کا ڈر نہ جیل جانے کا خوف،فوج کی گولیوں سے حکومت کا سارا رعب اور دبدبہ ختم ہو گیا۔اس تحریک نے انگریزی حکومت کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں گاندھی جی کی قیادت ،عدم تشدد،سچّائی اور اخلاقی اصولوں پر زیادہ زور تھا۔اس سے یہ تحریک ہر اعتبار سے قوی اور مقبول تھی اور جس نے مسلسل منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے میں مدد کی۔

گاندھی جی کی قیادت میں ۱۹۳۰ء میں مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے کانگریس نے دوبارہ عوامی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔اس کا اثر برطانوی حکومت پر اس قدر پڑا کہ اس نے دس،گیارہ مہینے میں ہی کانگریس سے سمجھوتہ کرنے میں عافیت سمجھی۔اس سے گاندھی جی انتہائی قدآور نیتا بن گئے۔انھوں نے ۱۹۳۲ء میں پھر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی لیکن اس دفعہ تحریک کو برطانوی حکومت نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں کانگریس کو صوبہ جاتی اسمبلیوں کے الیکشن میں چھ صوبوں میں بڑی کامیابی ملی۔چنانچہ گاندھی جی

> ''ان کا کہنا تھا کہ ہر انسان میں فطری طور پر مذہبی جذبہ پایا جاتا ہے اور اسے پوری طرح سے ترقی دینے اور اجاگر کرنے کے لئے سچّائی اور اہنسا پر عمل کرنا از حد ضروری ہے۔بغیر اہنسا کے انسان سچّائی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔جو شخص دوسروں کے خلاف تشدّد استعمال کرتا ہے وہ سچّائی سے دور جا پڑتا ہے تشدّد سب سے بڑا جھوٹ ہے اور سچّائی کے بالکل منافی ہے اس لئے کہ یہ زندگی کے تقدّس کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

کی قیادت میں یکے بعد دیگرے کامیابی کی منزلیں طے ہوتی گئیں۔ایک دن ایسا آیا کہ مرکز میں ہندوستان کی نمائندہ حکومت کے قیام کی تجویز سامنے آئی۔اکتوبر ۱۹۴۰ء میں گاندھی جی نے سامراجی جنگ کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا جس میں کانگریس کے ہزاروں ورکر جیل گئے۔بامبے کے اجلاس منعقدہ ۱۹۴۲ء میں ''انگریز ہندوستان چھوڑو'' کا نعرہ بلند ہوا اور یہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور بالآخر انگریزوں کو ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے جانا پڑا:

''یہ ہندوستان کی آزادی کی آخری عوامی تحریک تھی بالآخر اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا لیکن یہ آزادی تقسیم ملک کی صورت میں ملی اور پنجاب میں زبردست کشت وخون ہوا۔گاندھی جی نے اس کی کوشش کی کہ ہندوستان غیر مذہبی جمہوریت مضبوط ہو اور ہندو مسلم اتحاد قائم رہے اور اس کی شب و روز جدّوجہد کرتے رہے۔ ۳۰/جنوری ۱۹۴۸ء کو وہ ایک فرقہ پرست جنونی کی گولیوں کا شکار ہوئے لیکن انھوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر اس ملک میں غیر مذہبی جمہوریت کو مضبوط کر دیا یہ ان کا لاثانی کارنامہ ہے وہ صحیح معنوں میں بابائے قوم تھے۔''(۶)

گاندھی جی نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم کیا اور انگریزوں کے خلاف بار بار ستیہ گرہ کیا جس کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کا سنہرا باب شروع ہوتا ہے۔گاندھی جی نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے توپ و تفنگ یا ہتھیاروں سے کام لینے کے بجائے ستیہ گرہ کے حربے سے کام لے کر انگریزوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور بالآخر وہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہوئے۔

حوالے:

۱۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، ڈاکٹر ہاشم قدوائی۔صفحہ:۲۳۱

۲۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، ڈاکٹر ہاشم قدوائی۔صفحہ:۲۲۴

۳۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، ڈاکٹر ہاشم قدوائی۔صفحہ:۳۱۵

۴۔ میری کہانی حصہ اول۔پنڈت جواہر لال نہرو۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔صفحہ:۱۴۳۔۱۹۳۹ء

۵۔ خیالات گاندھی جی۔صفحہ:۱۲۰

۶۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار، ڈاکٹر ہاشم قدوائی۔صفحہ:۲۱۷

❑❑❑

ندیم حسنین
میٹروسٹی اپارٹمنٹ، نشاط گنج لکھنؤ
رابطہ: 9721533337

مہاتما گاندھی، ماحولیات اور انسانی حقوق

اس مختصر سے مضمون کو میں اپنے دو ذاتی تجربات سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۸ء کے درمیان میں امریکہ میں فل برائٹ پروفیسر اور پھر وزٹنگ پروفیسر کے طور پر رہا ہوں۔ نیویارک کی سینٹ لارنس یونیورسٹی سے میں منسلک کیا گیا تھا۔ اپنے پہلے ہفتے کے قیام کے دوران مجھے پوری یونیورسٹی کو دکھایا جا رہا تھا تو اس کے شاندار اور وسیع چرچ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پر جب ایک کافی بڑے شیشے کے پینل پر اپنی لاٹھی کے ساتھ مہاتما گاندھی کو دیکھا تو مجھے خوشی کے ساتھ بڑے فخر کا احساس ہوا۔

دوسرا واقعہ وہاں کے کچھ طالب علموں سے متعلق ہے۔ جب میں گلوبل اسٹڈیز کے شعبے میں ساؤتھ ایشیا کے سماجوں پر ایک کورس پڑھا رہا تھا تو ایک دن رچرڈ ایٹن بارو کی فلم گاندھی کو دکھانا تھا۔ جب ۳۰ لڑکے لڑکیوں کے کلاس میں میں نے پوچھا کہ کتنے لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے تو دو کو چھوڑ کر سب سے ہاتھ اٹھا دئے۔ اگلے دن فلم دکھانا تھا۔ میں نے باقی لوگوں کو کلاس میں آنے کی چھوٹ دے دی لیکن اگلے دن جونہی میں کلاس میں گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سبھی موجود تھے اور فلم کو دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ فلم کے دوران دو لڑکیاں آنسوؤں سے رو رہی تھیں جب کہ میرے کلاس میں سبھی طلباء سفید فام امریکی تھے۔ گاندھی میں یہ دلچسپی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی اور حیرت ہوئی۔ ہندوستان میں کئے گئے ایک حالیہ سروے میں یہ بات نکلی کہ موجودہ نسل کے آدھے سے زیادہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مہاتما گاندھی کو Source of inspiration پاتے ہیں۔

گاندھی جی کی زندگی اور تعلیمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن ماحولیات کو لے کر ان کے خیالات کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں میں کوشش کر رہا ہوں کہ ماحولیات سے متعلق ان کے خیالات کو اختصار سے پیش کرتے ہوئے انسانی حقوق کے بارے میں ان کے خیالات سے جوڑ کر دیکھا جائے۔ جدیدیت اور جدید سماج سے ان کے اختلافات کے پیچھے یہ سوچ مضمر تھی کہ آج کے انسان اپنے فوری فائدے کے لئے قدرتی ذرائع کو کس بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔ صنعت کاری اور مادیت کے بے دریغ استعمال کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس کے بے انتہا استعمال سے زمین کے قدرتی وسائل بہت جلدی اتنے کم ہو جائیں گے کہ موجودہ انسانی آبادی کے لئے بھی ناکافی ہوں گے۔

ماحولیات کے ماہرین جن الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں، اس سے گاندھی جی واقف نہیں تھے لیکن اپنی زبان میں وہ وہی بات کہہ رہے ہیں جس کو ماہرین اپنی تکنیکی زبان میں کہہ رہے ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لئے قدرتی وسائل چھوڑ کر جانے کی بات کہہ کر وہ موجودہ Sustainabled Development کی تھیوری کو اپنی زبان میں کہہ رہے تھے۔ ان کا ایسا سوچنا تھا کہ تہذیب کے جس مغربی ماڈل کو ہم اپنا رہے ہیں اس میں شہر اور گاؤں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ گاؤں کی قربانی دینا ہی پڑے گی۔ طرزِ زندگی کے طور پر جدید تہذیب کو رد کرتے ہوئے انہوں نے کھیتی، چرخا اور گاؤں کو استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ وہ مشینوں کے خلاف نہیں تھے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اس مشینی عہد میں جسمانی محنت کا بھی کافی استعمال ہے جو ہماری صحت کے لئے بھی ضروری ہے۔

موجودہ صنعتی عہد میں جس طرح ہوا اور پانی کو بے انتہا آلودہ کیا جارہا ہے اسے لے کر وہ بہت فکرمند تھے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو اس کے خلاف ستیہ گرہ کر رہے ہوتے۔ وہ بار بار کہتے رہے کہ ہمیں سادہ زندگی اپنا نا چاہئے جس سے اس زمین پر رہنے والے سبھی لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے میں دقت نہ ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ سبھی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وسائل کافی ہیں لیکن لوگوں کی لالچ کے ناکافی ہوں گے۔ قدرتی وسائل اور دولت کو وہ وقف کے طور پر مانتے تھے اور ان کا سوچنا تھا کہ ہم اس کے مالک نہ ہو کر صرف اس کے ٹرسٹی یا امانت دار ہیں۔ انہوں نے خود اپنی زندگی کو یکسر بدل کر دکھایا اور اس طرح ان کی زندگی امن کا پیغام بن گئی۔

قدرتی وسائل اور ماحولیات کو لے کر اپنے خیالات کو انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں عمل کر کے دکھایا۔ کفایت شعاری کو وہ ان مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ آنے والے خطوط کے پیچھے لکھا کرتے تھے، نہانے میں بھی پانی کا استعمال نہایت کفایت شعاری سے کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے قدرت کے وسائل کے استعمال میں کفایت شعاری کی مثال پیش کی۔

گاندھی جی کا ماننا تھا کہ غریبی تبھی دور ہوسکتی ہے جب دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور سبھی کو اس کی ضرورت بھر کا ملے نہ کہ دوسروں کے حصے کا ہتھیا کر۔ ان کا یقین تھا کہ قدرت ہی سبھی معاشی قدروں کا ذریعہ ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ شدت کے ساتھ ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ بے انتہا انفرادیت نے اجتماعیت کو ختم کر دیا ہے جس سے ہماری خودغرضی اتنی بڑھی ہے کہ ہم قدرتی وسائل لوٹ میں لگ گئے۔

ماحولیات اور قدرتی وسائل کے سیاق میں انسانی حقوق کے بارے میں ان کے خیالات اپنے وقت سے آگے چل رہے تھے۔ انسانی سماج کے لئے دونوں ہی بہت ضروری ہیں۔ انسانی حقوق کی بنا پر انسانی سماج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹ کے بعد انسان کے بنیادی حقوق پر لگاتار حملے ہوتے رہے ہیں۔ گاندھی جی کی پوری زندگی انسانی حقوق کے دفاع کے لئے ایک چارٹ کی طرح ہے۔

انہوں نے دوسروں کے حقوق کے لئے قربانیاں دیں۔ انسان اور انسانیت سے پیار کرنا سکھایا۔ انسانی سماج کی بقا اور بہبود کو لے کر ان کی جدو جہد مثالی ہے۔ انسانی حقوق کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ زور امن پر دیا کیونکہ امن کے بنا انسانی حقوق کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ ہر انسان کو امن و آشتی کے ساتھ جینے کا حق ہونا چاہئے۔ گاندھی جی ہمیشہ ایسی طاقتوں سے لڑنے کے لئے تیار رہتے تھے جو انسانی سماج کے امن کو برباد کرنا چاہتی ہیں۔ وہ بنا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل سبھی کی فلاح کے حمایتی تھے۔ ان کا سرودیہ کا فلسفہ سبھی کے فلاح پر مبنی تھا۔

مہاتما گاندھی دیکھ رہے تھے کہ قدرتی وسائل پر اپنی حکومت کو لے کر کسی طرح مختلف ممالک میں لڑ رہے تھے۔ استعماری نظام اس بات پر ہی مبنی تھا کہ دوسرے ممالک اور علاقوں کے قدرتی وسائل پر فوجی طاقت کے ذریعہ قبضہ کیا جائے بھلے ہی اس لوٹ مار سے ماحولیات کتنی ہی متاثر کیوں نہ ہو۔ مسائل کے پرامن حل اور تصفیہ پر ان کا بیحد زور یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ سبھی کے حقوق اور وسائل کی پرامن اور منصفانہ تقسیم کو لے کر کتنا سنجیدہ تھے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ انسانی حقوق کو غریبی، بے روزگاری اور معاشرتی نابرابری سے بچانا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر اب دنیا میں انسانوں کو زندہ رہنا ہے تو ہمیں گاندھی جی کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔

کبھی کبھی ایک جیسے ہی دو واقعات انسانی سماج کے رخ کو موڑ دیتے ہیں۔ یہاں پر میں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ پہلا ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ کا اور دوسرا ۱۹۵۶ء میں امریکہ کا جس نے شہری حقوق اور انسانی حقوق کی تحریک کا رُخ ہمیشہ کے لئے موڑ دیا۔ پہلا واقعہ ساؤتھ افریقہ کے Peter Martizburg ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا تھا جب گاندھی جی کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے سے صرف اس لئے دھکا دے کر نکال دیا تھا کہ ان دنوں اس کلاس میں صرف گورے لوگ ہی سفر کر سکتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا واقعہ محترمہ روز پارک جو ایک سیام فام عورت تھیں، کے ساتھ پیش آیا جب انہوں نے امریکہ کے الباما صوبہ کے مانٹوگومری شہر میں اس بس سے اترنے سے انکار کر دیا تھا جس پر صرف سفید فام لوگ ہی سفر کر سکتے تھے۔ مہاتما گاندھی کا ایک قول ہمارے لئے رہنمائی کر سکتا ہے:

'جب میں مایوس ہوتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا سارے قاتل اور ظالم سماج پر حکومت کریں گے؟ لیکن جب تاریخ میری رہنمائی کرتی ہے کہ آخر میں وہ سبھی ہارتے تھے اور پیار اور سچائی کی جیت ہوئی تھی۔'

❑❑❑

ڈاکٹر عبدالسمیع
مکان نمبر 1/326، محلہ آلوتھوک، ہردوئی
رابطہ: 9760223678

مہاتما گاندھی کے طبی افکار و تجربات
اور عصر حاضر میں ان کی معنویت وافادیت

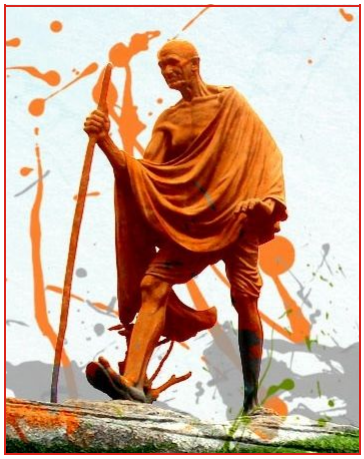

موہن داس کرم چند گاندھی جنہیں ہم مہاتما گاندھی یا گاندھی جی کے نام سے جانتے ہیں، ہم انہیں پیار اور احترام سے باپو بھی کہتے ہیں وہ ہندوستانی عوام ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کے لئے قابل احترام شخصیت تھے انہوں نے ایک سیاسی اور روحانی رہنما کی حیثیت سے تحریک آزادی میں سب سے اہم حصہ لیا ستیہ گرہ اور عدم تشدد کو اپنا ہتھیار بنایا، وہ امن وامان اور حقوق انسانی کے علمبردار تھے، ۲/اکتوبر گاندھی جی کی تاریخ ولادت ہے یہ دن پوری دنیا میں سچائی ، عدم تشدد اور امن وشانتی کے طور پر منایا جاتا ہے ،مہاتما گاندھی کی زندگی عوام کے لئے قابل تقلید ہے ان کا اصل نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا،لیکن دنیا انہیں مہاتما گاندھی کے نام سے جانتی ہے انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور سماج میں بھی عظیم المرتبت شخصیت ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھا، سادہ زندگی بسر کرتے تھے ہندوستانی روایتی لباس دھوتی اور شال کا استعمال کرتے تھے، جسے وہ خود چرخہ پر بُنتے تھے،تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ،اپنے کو کسی سے بڑا نہیں جانتے ،سادہ اور سبز کھانا کھاتے ،سماجی اور روحانی زندگی کے لئے لمبے لمبے روزے رکھا کرتے تھے مہاتما گاندھی کی انہیں تمام خصوصیات اور عادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے انہیں مہاتما کا لقب دیا اور پھر ان کے نام کے ساتھ یہ لقب ایسا جڑا کہ لوگ انہیں مہاتما گاندھی ہی کے نام سے جاننے لگے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی باشندوں کے شہری حقوق کے سلسلے میں کی جانے والی کوششیں گاندھی جی کی زندگی کا ایک روشن باب ہیں ، ہندوستان میں شہری مزدوروں اور کسانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج نے انہیں عظیم رہنما بنا دیا، ملک سے غربت کم کرنے ،نسلی اور مذہبی خیر سگالی، حقوق نسواں کی بازیابی، چھوا چھوت اور اونچ نیچ کو ختم کرنے کی کوششیں، ملک کی معاشی حالت سنبھالنے کی فکر مندی، ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے کی جانے والی جدوجہد نے گاندھی جی کو اتنا عظیم بنا دیا کہ انہیں ہندوستان کے بابائے قوم کا لقب دیا گیا مہاتما گاندھی کی زندگی میں مخصوص اصول وضوابط اور افکار ونظریات ہمیں نظر آتے ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں جو تجربات کئے اور جن چیزوں کو سچ سمجھا اور جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا اسے تحریری شکل میں بھی پیش کیا، زندگی کے جن پہلوؤں پر مہاتما گاندھی نے اپنی نگارشات پیش کیں ان میں ایک اہم حصہ حفظان صحت، طبی علاج ومعالجہ کا بھی ہے۔

خوراک اورصحت کے حوالہ سے مہاتما گاندھی نے قیمتی مضامین لکھے،مہاتما گاندھی نے یہ طبی مضامین گجراتی زبان میں لکھے اسی طرح ایک کتاب آروگیہ دگ درشن بھی مہاتما گاندھی کے حوالہ سے ملتی ہے ایک کتاب گرہست جیون عورت اورمرد کے تعلقات کے بارے میں مہاتما گاندھی نے لکھی اب یہ کتابیں اردوزبان میں ترجمے کی صورت میں دستیاب ہیں اگر ان کتابوں کے موضوعات اورمضامین کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اورطبی افکاروخیالات کے بارے میں گفتگو کی جائے تو اسکے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہوگی یہاں اختصار کے ساتھ ان کتابوں کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے گا کہ مہاتما گاندھی طبی اصول وضوابط سے کس قدر واقف تھے اورانہوں نے اپنی زندگی میں صحت اورخوراک کے کتنے اہم اور مفید تجربے کئے، اکسیرسیالکوٹی مہاتما گاندھی کی خوراک اورصحت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اٹھارہ سال کی عمر میں سے ہی مہاتما جی اپنی زندگی میں خوراک اورصحت کے مضمون پراپنے تجربات کررہے ہیں۔اپنے تجربات سے اگرچہ اُن کی خود مکمل طور پر تسلی نہیں ہوئی،تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم رشیوں کے جو تجربات ہمارے شاستروں (مذہبی کتب) میں لکھے ہوئے ہیں۔وہ کسی حدتک اُن کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔اوراُن کے تجربات میں موجودہ زمانے کے کسی بھی مہاپرش کی نسبت سچائی زیادہ پائی جاتی ہے۔''(۱)

ہم اپنی بات مہاتما گاندھی کی ایک اہم کتاب ''آروگیہ دگ درشن'' کے اردوترجمہ سے شروع کرتے ہیں اس کتاب کے دوتراجم ملتے ہیں اردوزبان میں اس کتاب کے ایک اہم مترجم پروفیسررام سروپ کوشل ایم اے ہیں انہوں نے شاہراہِ تندرستی کے نام سے مہاتما گاندھی کی اس اہم کتاب کا مکمل ترجمہ کیا ہے دوسرے مترجم حکیم محمد اعظم خان نے حصہ اول حفظانِ صحت کا ترجمہ کیا ہے۔حصۂ اول جو حفظانِ صحت سے متعلق ہے اس حصہ میں تندرستی ، ہمارا جسم، ہوا، پانی ،خوراک دن میں کتنی مرتبہ اورکتنی دفعہ کھانی چاہئے،ورزش،پوشاک،مردوعورت کا باہمی تعلق،ان نو(۹) موضوعات کے تحت مہاتما گاندھی کے تجربات اورخیالات کواردو کا جامہ پہنایا گیاہے یہ تمام موضوعات علم حفظانِ صحت سے متعلق ہیں حفظانِ صحت میں امراض کے تعلق سے احتیاط برتنے ،صاف ستھرے ماحول،غذا،پانی کے استعمال اور طہارت کا ذکر ہوتا ہے اچھی صحت اور بیماریوں سے محفوظ معاشرہ کے لئے حفظانِ صحت کی بڑی اہمیت ہے جس سے بیماری لاحق ہونے سے قبل ہی اس سے بچاؤ کی تدابیر کی جاتی ہیں ،طب میں حفظانِ صحت کو ایک مقدمہ کے طور پر سمجھا جاتا ہے ۔ تمام مذاہب میں حفظانِ صحت کی بڑی اہمیت ہے،مذہب اسلام طہارت وپاکیزگی کو نصف ایمان قرار دیتا ہے ،علم حفظانِ صحت متعدی امراض اورجان لیوا بیماریوں سے بچنے میں مفید ثابت ہوتا ہے اورحفظانِ صحت سے عدم واقفیت سماج ومعاشرہ کے لئے تباہی وبربادی کا سبب بنتی ہے اسلئے مہاتما گاندھی نے اسکی طرف توجہ دی اوراس موضوع پر یہ اہم کتاب لکھی جس کا پہلا حصہ علم حفظانِ صحت پر مشتمل ہے اس کے پہلے حصہ کا ایک ترجمہ رہنمائے صحت کے نام سے حکیم محمد اعظم خاں نے بھی کیا ہے،حکیم محمد اعظم خاں اردوزبان میں حفظانِ صحت پر کم کتابیں لکھے جانے کا شکوہ کرتے ہیں اورگاندھی جی کی اس کتاب کو حفظانِ صحت کی عام فہم آسان اورمفید کتاب قرار دیتے ہیں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''اس (اردو) میں حفظانِ صحت پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئیں انکی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے ان چند میں بھی زیادہ تر ایسی کتابیں ہیں جو ملک کی موجودہ ضروریات کے مطابق نہیں۔یہ عموماً ضخیم۔ ان کے مطالب بیشتر فنی اور ان کی زبان اکثر ایسی نامانوس ہوتی ہے کہ عوام ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاسکتے۔حالانکہ آجکل ضرورت ایسے مختصر رسالوں کی ہے جن میں سلیس زبان اورعام فہم طرزادا میں حفظانِ صحت کے ابتدائی اصول بیان کئے جائیں اورجن کی قیمت اتنی ہو کہ ہرشخص ان سے بآسانی مستفید ہوسکے حُسن اتفاق سے ایسی ہی ایک کتاب میری نظر سے گذری جوان تمام خصوصیات کو بخوبی پوراکرتی تھی۔یہ معلوم کرکے اکثرلوگوں کوتعجب ہوگا کہ مہاتما گاندھی نے اپنے سیاسی اور سماجی مشاغل کے باوجود حفظانِ صحت جیسے ضروری علم کی طرف سے تغافل نہیں کیا اوراپنے ہم وطنوں کے لئے اس کے ابتدائی اصول پر گجراتی زبان میں ایک چھوٹی سی نہایت ضروری اورمفید کتاب لکھی۔''(۲)

مہاتما گاندھی کی اس اہم کتاب ''اروگیہ دگ درشن'' کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تندرستی کے مسائل میں حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے،بیماری کودورکرنے کی تدابیر سے اچھا یہ ہے کہ بیماری پیدا ہی نہ ہونے دی جائے ان سب چیزوں کے بارے میں مہاتما گاندھی نے کس اہمیت اورخوبی کے ساتھ اپنے افکاروخیالات بہترین انداز میں پیش کئے ہیں ان کے افکاروخیالات میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو اپنا کر مرض سے بچا جاسکتا ہے مہاتما گاندھی کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ڈاکٹروں اورحکیموں سے علاج ومعالجہ کرانا کوئی بری چیز ہے بلکہ ان کا کہنا ہے یہ ہے کہ پہلے حفظانِ صحت کے لئے مختلف تدابیر کواپنایا جائے اوراگر ڈاکٹر کودکھانا یا بلانا ہی ضروری معلوم پڑے تو کسی اچھے سمجھدار اورتجربہ کار ڈاکٹر کو بلاؤ اوردکھاؤ اوراسکی رائے کے مطابق عمل کرو دوسرے

ڈاکٹر یا حکیم کو اسی وقت بلانا یا دکھانا چاہئے جبکہ پہلا ڈاکٹر ایسا کرنے کی صلاح دے ،تندرستی کیا ہے عوام کس چیز کو تندرستی سمجھتے ہیں اور حقیقی تندرستی ہم کسے کہہ سکتے ہیں اس کے بارے میں مہاتما گاندھی کی رائے ملاحظہ کریں:

''عوام سمجھتے ہیں کہ انسان کھاتا پیتا ہو۔اچھی طرح چلتا پھرتا ہو اور حکیموں ڈاکٹروں کے ہاں نہ جاتا ہو۔تو وہ تندرست ہے۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خیال غلط ہے۔بہت سی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ لوگ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہوئے بھی بیمار ہوتے ہیں۔لیکن وہ مرض کی پرواہ نہ کرکے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہمیں کوئی بیماری نہیں ہے یعنی ہم تندرست ہیں۔سچ بات تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں بالکل تندرست آدمی بہت ہی تھوڑے ملیں گے۔''(۳)

''اسی طرح غور کرنے پر ہم اُسی شخص کو تندرست وتوانا کہہ سکتے ہیں کہ جس کے جسم میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔جس کا جسم ہر پہلو سے مکمل ہے۔دانت درست ہیں۔آنکھ کان ٹھیک ہیں ،ناک نہیں بہتا،جس کی کھال سے پسینہ بہتا رہتا ہے۔مگر اس سے بدبو نہیں آتی جس کے پاؤں گندے نہیں ہیں۔ منہ سے بدبو نہیں آتی۔ہاتھ پاؤں معمولی طور پر کام کرسکتے ہیں ،جو نفسیات کا شکار نہیں ہے۔جس کا جسم نہ بہت موٹا ہے۔نہ بہت پتلا اور جس کا دل اور حواس ہمیشہ اسکے قابو میں ہوں۔اس قسم کی صحت کا حاصل کرنا۔اور اس کا قائم رکھنا آسان بات نہیں ہے ۔ہمیں ایسی صحت نصیب ہے۔''(۴)

ان دونوں اقتباسات سے صحت وتندرستی جو کہ ہزار نعمت ہے کے بارے میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ظاہر میں نظر آنے والے، تندرست وتوانا، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے آدمی کو تندرست سمجھتے ہیں حالانکہ اصل تندرستی صرف جسمانی تندرستی نہیں ہے بلکہ مکمل جسمانی دماغی اور سماجی اعتبار سے صحت مند ہونا اصلی اور حقیقی تندرستی ہے مہاتما گاندھی نے بھی انہیں چیزوں کو تندرستی بتایا ہے اور عالمی ادارۂ صحت WHO نے بھی صحت کی یہی تعریف کی ہے حکیم محمد یوسف انصاری W.H.O کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحت کی تعریف: یہ ایک عام تصور ہے کہ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ادارہ عالمی صحت WHO کے مطابق :''کمزوری یا بیماری کی عدم موجودگی کا نام صحت نہیں ہے بلکہ مکمل جسمانی ، دماغی اور سماجی اعتبار سے اچھی کیفیت کو صحت کہا جاتا ہے''۔

Health is a state of complete physical,mental and social wellbeing and not merely an absence of disease or infirmity.

اس سے ثابت ہوا کہ صحت ایک سہ رخی کیفیت ہے یعنی بہتر صحت کیلئے جسمانی ،دماغی اور سماجی عوامل بہت ضروری ہیں۔اکثر ماہرین اس فہرست میں روحانی صحت Spiritual Health کا بھی شمار کرتے ہیں۔''(۵)

اس طرح ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ علم طب پر مہاتما گاندھی کی کتنی گہری نظر تھی،W.H.O جو عالمی سطح پر صحت کا ادارہ ہے اور جس کا قیام مہاتما گاندھی کے ان افکار وخیالات کے اظہار کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے دوران ہی قیام عمل میں آیا،سات اپریل ۱۹۴۸ء کو ادارہ عالمی صحت (W.H.O) کا دستور نافذ کیا گیا۔دنیا کے اکثر ممالک اسکے ممبر ہیں دنیا بھر کے ماہرین اطباء نے صحت کی جو تعریف کی وہ مہاتما گاندھی کے نظریہ تندرستی سے ملتی جلتی ہے مہاتما گاندھی کا مشاہدہ طبی علاج ومعالجہ اور جدید ادویہ کے سلسلہ میں بھی بہت وسیع تھا وہ اس زمانہ کے اس قبیح وناجائز دھندے سے واقف تھے جو کم داموں پر دوا تیار کرکے نہایت مہنگے داموں پر فروخت کے ذریعہ عروج پر تھا۔ اکیسویں صدی میں یہ دھندا اور زیادہ عروج وترقی پر ہے ،آج بھی دوا بنانے والی کمپنیاں چند پیسوں میں تیار ہونے والی دوائیاں ہزاروں روپئے میں فروخت کرتی ہیں جس کا علم عوام کو کبھی کبھی کچھ ایماندار ڈاکٹر یا سماجی فلاح وبہبود کے لئے کام کرنے والے کارکنان کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔وہ شوشل میڈیا پرنٹ میڈیا کے ذریعہ دواؤں کی کمپنیوں کے اس گورکھ دھندے پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

''جن اخباروں کو اور کسی قسم کے اشتہار نہیں ملتے اُنہیں ادویات کے بڑے بڑے اشتہار بآسانی مل جاتے ہیں۔جب انڈین اوپینس میں اشتہار لئے جاتے تھے۔اور اُس کے منتظم لوگوں کے پاس اشتہاروں کے لئے جایا کرتے تھے۔تو دوافروش اُس میں دوائیوں کو اشتہار چھاپنے کے بڑا اصرار کیا کرتے تھے۔اور اس کا پورا دام ادا کرنے کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کرتے،جس دوا کی قیمت ایک پائی ہوتی ہے۔اس کا ہم ایک روپیہ دیتے ہیں۔اگر ہم ایسی دواؤں کے بنالینے کی کوشش کرنا چاہیں۔تو اُن کے بیچنے والے ہمیں اس بات کا بھی پتہ نہیں لگنے دیتے کہ وہ کس طرح تیار کی جاسکتی ہیں،پوشیدہ یا سربستہ دوائیں نامی کتاب ایک ڈاکٹر نے اس غرض سے لکھی ہے۔کہ لوگ اُسے پڑھ کر غلطی سے بچیں۔اس میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ سارسا پریلا۔فروٹ سالٹ۔سیریپ وغیرہ جو پیٹنٹ ادویات ہیں۔اُن کے لئے ہم سوا دو روپیہ سے سوا پانچ روپیہ تک ادا کرتے ہیں۔لیکن ان

دواؤں پر صرف ایک پیسہ سے چار پیسہ تک لاگت آتی ہے۔اگر حساب لگا کر دیکھا جائے تو ہم اُن کیلئے کم از کم چھتیس گنی اور زیادہ سے زیادہ تین سو چھتیس گنی قیمت ادا کرتے ہیں۔غرضیکہ ہم اس حالت میں تین ہزار پانسو ٹکے سے لیکر پچیس ہزار ٹکے تک کا منافع دیتے ہیں۔''(۶)

اس اقتباس سے ہمیں دواؤں کے اشتہارات اور انکے پر چار اور نہایت کم قیمت دواؤں کو بڑی قیمتوں پر فروخت کئے جانے کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے اگر ہندوستانی حکومت جو مہاتما گاندھی کو بابائے قوم مانتی ہے انکے اصولوں اور آدرشوں کا سمان کرتی ہے امن وشانتی عدم تشدد اور سچائی جیسے مہاتما گاندھی کے اصولوں کا پر چار کرتی ہے میدانِ طب کے ان غلط طریقوں کے بارے میں گاندھی جی کے اصول وضوابط اور افکار وخیالات کو اگر وہ اپناتی تو یقینا آج ہمارا ملک نہایت ترقی یافتہ ہوتا اور ہم بھی سستے اور بہترین علاج ومعالجہ سے فیض یاب ہو رہے ہوتے طبی اداروں، اسپتالوں اور علاج ومعالجہ کی یہ صورتِ حال نہ ہوتی جس سے آئے دن ہم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اگر اب بھی مہاتما گاندھی کے افکار وخیالات اور اصول وضوابط پر حکومت وعوام عمل کرلیں تو ہم یقینا بہت فائدہ میں رہیں گے اور ملک وقوم کی ترقی میں یہ باتیں نہایت اہمیت وافادیت کی حامل ہونگی مہاتما گاندھی اس بات کا بھی شکوہ کرتے ہیں اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ جب بیماری کا علاج دواؤں کے ذریعہ شروع ہوجاتا ہے تو پھر ساری زندگی اس سے نجات نہیں ملتی اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

''تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جہاں ایک دفعہ کسی گھر میں دوا کی شیشی داخل ہوئی، پھر وہ کبھی نکلنے کا نام نہیں لیتی بلکہ اپنے ساتھ اور شیشوں کو بھی کھینچ بلاتی ہے، ایسے بیشمار لوگ ہم کو ملتے ہیں۔جو نہایت اعتقاد سے دواؤں کا استعمال کرنے کے باوجود عمر بھر کسی نہ کسی مرض میں مبتلا رہتے ہیں۔وہ آج ایک ڈاکٹر کا علاج کرتے ہیں۔کل دوسرے کا۔غرض ان کی ساری عمر کسی ایسے ڈاکٹر کی ناکام تلاش میں گذر جاتی ہے جو انہیں ہمیشہ کیلئے تندرست کردے۔''(۷)

اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے ہمیں اپنے سماج ومعاشرہ میں سیکڑوں ایسے لوگوں کا خیال آتا ہے جو مستقل ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں کا چکر لگاتے رہتے ہیں بلکہ آج تو ڈاکٹروں اور اطباء نے بہت سی بیماریوں کے لئے یہ تجویز کردیا ہے کہ اگر اس مرض کو کنٹرول میں رکھنا ہے تو ساری عمر دوا کا استعمال کرنا ہوگا ذیابطیس، ضغط الدم قوی، تھائی رائڈ کی زیادتی اور بہت سے امراضِ قلب، معدہ، کلیہ وغیرہ اسی ضمن میں آتے ہیں، مہاتما گاندھی کی رائے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کتنی درست تھی اور ان کا مشاہدہ وتجربہ اس سلسلہ میں کتنا وسیع تھا، اس اقتباس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔آج ہندوستان میں چائے اور کافی کا عام رواج ہے ان کی مضرت اور نقصانات کا عوام کو بخوبی اندازہ بھی ہے، ڈاکٹر حضرات بھی اسکے نہ استعمال کرنے یا کم استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن ہمارے یہاں پروگراموں، جلسوں، دعوتوں، شادی وغیرہ کی تقریبات اور مہمانوں کی ضیافت میں ان دونوں چیزوں کا کافی رواج ہے مہاتما گاندھی چائے اور کافی دونوں کو مضر صحت مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان سب چیزوں میں ایک طرح کا زہر ہوتا ہے اگر ان میں دودھ اور شکر نہ ملائی جائے تو ان میں کوئی مقوی جز نہیں رہتا اور ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو مصفی خون ہو، قوت ہاضمہ پر ان سب کا بہت برا اثر پڑتا ہے جو شخص اس کا عادی ہوجائے وہ اسے بڑی مشکل سے چھوڑتا ہے انگلستان کے ایک ڈاکٹر کی تحقیقات کو بیان کرتے ہوئے مہاتما گاندھی لکھتے ہیں کہ اس کے علاقہ میں ہزاروں عورتوں کے دماغ کی رگیں چائے کی کثرت استعمال کی وجہ سے خراب ہوگئیں کافی اگرچہ بلغم اور بادی میں کچھ مفید ہے لیکن اسکے ساتھ مادہ تولید کو خراب کرکے سارے جسم کو کمزور اور خون کو پانی کی طرح رقیق کردیتی ہے چائے، کافی اور کوکو کی مزدوری بھی غریبوں سے اس طرح کرائی جاتی ہے جو دراصل غلامی کا ایک شائستہ نام ہے مہاتما گاندھی نے چائے اور کافی کو ترک کرنے کا مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ ان کے متبادل کے طور پر جسم کے لئے مفید، طاقت ور چیز کی بھی نشاندہی بھی کی ہے اس بارے میں مہاتما گاندھی رقمطراز ہیں:

''کافی (چاء یا کوکو) کے بدلے مندرجۂ ذیل طریقہ پر ایک ایسی عمدہ اور بے ضرر چیز تیار کی جاسکتی ہے کہ جو لوگ کافی پینے کے عادی ہیں وہ بھی اُس کے اور کافی کے ذائقہ میں کوئی امتیاز نہ کرسکیں۔عمدہ اور صاف کئے ہوئے گیہوں ایک کڑھائی میں ڈال کر خوب بھونتے جائیں۔جب وہ بالکل سرخ ہوکر سیاہی مائل ہونے لگیں تو انہیں کافی کی طرح باریک پیس لیا جائے۔اس سفوف کا ایک چمچہ پیالی بھر گرم پانی میں ڈال کر ایک منٹ کے لئے چولھے پر رکھدیں۔اس کے بعد اس میں بقدر ضرورت دودھ اور شکر ملالیں اس طرح ایک ایسی خوش ذائقہ چیز تیار ہوگی جو کافی سے بدرجہا سستی اور عمدہ ہے جو لوگ سفوف تیار کرنیکی زحمت سے بچنا چاہیں'' وہ ستیہ گرہ آشرم ''احمد آباد کے پتہ سے طلب کرسکتے ہیں۔''(۸)

طب وصحت کے لئے مہاتما گاندھی کی تجویز کردہ یہ چیز یقینا مفید ہوگی کیونکہ گیہوں اسکا جزء خاص ہے اور آج ہم اصلی قوت گیہوں کے ذریعہ تیار کردہ روٹی دلیہ اور مختلف اقسام کی چیزوں سے حاصل کرتے ہیں اس اناج کو مہاتما گاندھی نے بہترین ترکیب اور تجربہ کے ذریعہ اپنانے کی ہدایت کی ہے اس چیز

کو باقاعدہ عام کرنے کے لئے کمربستہ بھی تھے اور اپنے آشرم سے رہنمائی حاصل کرنے اورمعلومات طلب کرنے والوں کی مدد کا بھی انتظام کیا تھا۔

حفظانِ صحت کے علاوہ اس کتاب اروگیہ دگ درشن کا دوسرا حصہ علاج ومعالجہ پر مشتمل ہے اس حصہ میں ہوا ، پانی کا علاج،مٹی کا استعمال ، بخاراوراسکا علاج، قبض ،سنگرہنی،دست ، بواسیر،امراض متعدی، چیچک، چھوت دیگر بیماریاں ، پیدائش بچہ، پرورش اطفال، ناگہانی حادثہ،ڈوبنا،جلنا،سانپ کا کاٹنا،بچھو کا کاٹنا وغیرہ عنوانات کے تحت نہایت بیش قیمتی اور مفید علاج ومعالجہ کی معلومات پیش کی گئی ہیں یہاں پر صرف بچوں کی پرورش علاج ومعالجہ کے تعلق سے مختصراً گفتگو کی جاتی ہے بچہ کی پیدائش ماں کے لئے ایک بڑا مرحلہ ہوتا ہے مہاتما گاندھی کا ماننا ہے کہ اگر حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنایا جائے اور بچہ کی اچھی تربیت، ناگہانی بیماریوں اور تکالیف کا علم ہوتو ان تمام پریشانیوں سے بچا جاسکتا ہے، مہاتما گاندھی حاملہ عورت کے افکار وخیالات اطوار وعادات کو بچہ پر بہت زیادہ اثرانداز مانتے ہیں پاکیزہ اور صاف ستھرے خیالات ،اچھے اچھے کاموں میں مشغولیت ،بری عادتوں اور خصلتوں سے پرہیز، روحانی پاکیزگی ،جسمانی صفائی، تروتازہ آب وہوا، زودہضم غذا کو بچہ کی صحت اور تندرستی کے لئے مفید خیال کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں بڑی تفصیلی گفتگو کرتے ہیں بچوں کی پرورش کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس کو اچھی غذا دی جائے صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے ماں کا دودھ ہی اسکو پلایا جائے اگر ماں کا دودھ کم ہوتو گیہوں کو بھون کر کوٹ لینا چاہئے اور اس آٹے میں گرم پانی اور گڑ ملا کر بچہ کو پلایا جائے تو یہ بھی دودھ جیسا فائدہ کرتا ہے اگر آدھے کیلے کو زیتون کے تیل میں خوب ملا کر بچہ کو کھلا دیا جائے تو خوف فائدہ کرتا ہے اسی طرح کے مفید اور بہت سے اہم مسائل پر مہاتما گاندھی نے بہترین روشنی ڈالی ہے بچوں کے لباس پر بھی اہم معلومات درج کی ہیں وہ والدین کے عادات واطوار، معاملات وسلوک اور طرز زندگی کو بچہ پر سب سے زیادہ اثرانداز ہونے والی چیز قرار دیتے ہیں،اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

''ہمیں یہ بات فراموش نہ کردینی چاہئے۔کہ بچے کی تعلیم وتربیت پیدائش سے ہی شروع ہوجاتی ہے بچے کے اصلی اُستاد اُسکے والدین ہیں بچوں کو دھمکانا اوراُن پر بوجھ لادنا،اورانہیں ٹھونس ٹھونس کر کھلانا تعلیم کے اصول کی خلاف ورزی کرنا ہے۔اگر والدین نازک مزاج یا چڑچڑی طبیعت کے ہوں گے۔تو بچہ کی طبیعت بھی انہیں کے مانند ہوگی۔اُس کی طرز گفتگو بھی ماں باپ جیسی ہوگی۔اگر وہ تتلا کر بولتے ہیں تو بچہ بھی تتلا کر بولنے لگے گا۔اُن کے منہ سے گالیاں نکلتی ہونگی۔تو بچہ بھی گالیاں دینا سیکھ لیگا۔اگر ماں باپ بے انصافی کرتے ہوں گے۔تو بچہ بھی بے انصافی کرنا سیکھ جائیگا۔اور ماں باپ جو کچھ کھاتے پیتے ہوں گے بچہ بھی وہی سیکھ جائیگا۔اس لئے جو تعلیم بچہ گھر میں پاتا ہے۔ وہ بعدازاں اور کہیں نہیں ملتی۔مثل مشہور ہے:

'جیسا باپ ویسا بیٹا' یہاں باپ سے مراد والدین ہیں۔''(۹)

اختصار کی غرض سے علاج ومعالجہ کے ایک ہی نمونہ پر اکتفا کیا جارہا ہے پروفیسر رام سروپ کوشل نے اروگیہ دگ درشن کے دونوں حصوں حفظانِ صحت اور علاج ومعالجہ سے متعلق موضوعات ومضامین کا ترجمہ کیا ہے جبکہ حکیم محمد اعظم خان نے پہلا حصہ جس میں حفظانِ صحت سے متعلق مضامین ہیں صرف اسی کا ترجمہ کیا ہے دوسرا حصہ جو علاجوں پر مشتمل ہے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے،ایک اور شخص اکسیر سیالکوٹی نے ''خوراک اور صحت پر میرے تجربات'' کے نام سے مہاتما گاندھی کی کتاب کے مضامین کو ترجمہ کر کے پیش کیا ہے ان مضامین میں بھی اکثر باتیں اسی نوعیت کی ہیں جس کا ذکر اروگیہ دگ درشن کے سلسلے میں ہوچکا ہے ان مضامین میں مہاتما گاندھی نے جسم کی بناوٹ اور صحت خوراک کا ذکر کیا ہے،منشیات کے ضمن شراب اور بھنگ، افیون ،بیڑی، تمباکو،سگریٹ، چائے، کافی اور کوکا کے حوالے سے گرانقدر معلومات درج کی ہیں خوراک کی دوسری چیزیں نباتات، مسالہ، نمک، دودھ وغیرہ عناوین کے تحت مفید باتیں لکھی ہیں،خوراک کی مقدار اور اسکا طریقۂ استعمال بغیر آگ کو چھوئے خوراک کا استعمال ،پھل بطور خوراک عنوانات کے تحت اپنے تجربات بیان کئے ہیں اور تجربہ میں مشکلات کے عنوان سے ان چیزوں کے ذریعہ اپنے ساتھ پیدا ہونے والی پریشانیوں اور مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ہوا، روشنی موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے برہم چریہ کے تجربات، برہم چریہ کا عہد، برہم چریہ اور نفس، برہم چریہ اور روزہ ، برہم چریہ اور نفسانی جذبات عنوانات کے تحت اپنے تجربات، خیالات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ قدرتی ورزش صحت اور پوشاک کے سلسلہ میں اچھی باتیں لکھی ہیں مرض اور اسکا علاج کے ضمن میں علاج بذریعہ ہوا،علاج بذریعہ پانی،مٹی کے ذریعہ علاج، بخاراوراس کا علاج اسکے علاوہ قبض، سنگرہنی ، اسہال اور بواسیر کے بارے میں معلومات افزا تجاویز، تدابیر اور علاج کا ذکر کیا ہے،امراض متعدی میں چیچک کے اسباب، حفظ ماتقدم اور علاج کو بیان کرتے ہوئے چھوت کی دیگر بیماریوں میں طاعون، نیومان پلیگ، ہیضہ،پیچش کے سلسلے میں اپنی معلومات عمدہ اسلوب اور عام فہم زبان وبیان میں پیش کی ہیں ان مضامین میں سے صرف دو مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق حفظانِ صحت کے اہم جز ہوا سے ہے اور دوسرے کا تعلق معدہ کی اہم

بیماریوں قبض ،سنگرہنی، اسہال اور بواسیر کے سلسلے میں اپنائی جانے والی تدابیر سے ہے۔اقتباسات ملاحظہ کریں:

''ہوابلا قیمت ملے یا قیمت میں۔لیکن اس کے بغیر ہم ایک لمحہ بھی اپنا گذارہ نہیں کرسکتے۔ہم بتلا چکے ہیں، کہ خون تمام جسم میں دورہ کرتا ہے۔وہ پھیپھڑوں میں آکر صاف ہوتا ہے۔اور صاف ہو کر پھر دورہ کرنا شروع کردیتا ہے۔یہ عمل ہمارے جسم میں دن رات ہوتا رہتا ہے۔سانس باہر نکال کر ہم زہریلی ہواکو باہر نکالتے ہیں ۔اور سانس لے کر ہم ہوا سے زندگی بخش ہواکو اندر پہنچاتے ہیں۔اس کے ذریعہ خون کو صاف کرتے ہیں۔یہ عمل برابر ہوتا رہتا ہے۔اسی پر جسم کی زندگی کا انحصار ہے۔''(۱۰)

''اب ہمیں مندرجہ بالا امراض کے علاج پر غور کرنا چاہئے۔ان کا پہلا علاج تو یہ ہے کہ ان بیماریوں میں مبتلا شخص اپنی خوراک کم کردے۔بہت ثقیل غذا۔گھی،کھانڈ،ربڑی،ملائی کے زیادہ استعمال سے ہمیشہ پرہیز کریں۔ اگر بیڑی ،شراب،بھنگ وغیرہ پینے کی عادت ہوتو اسے ترک ہی کردینا چاہئے ۔میدہ کی روئی کھانے کی عادت ہوتو اسے بھی چھوڑ دیں۔ چائے،قہوہ اور کوکو سے پرہیز کریں۔ خوراک میں تازے پھلوں کا استعمال خاص طور پر کریں۔ اس کے ساتھ صاف زیتون کا تیل بھی استعمال کریں۔علاج شروع کرنے سے پہلے ۳۶ گھنٹہ تک فاقہ کریں۔اس اثنا میں یا اس کے بعد سوتے وقت پیڑو پر پلیٹس باندھیں۔اور دن میں ایک دفعہ سے لیکر دو دفعہ تک ڈاکٹر لوئی کوہنی کا غسل کریں۔ہر روز کم ازکم دو گھنٹے ضرور لیں جو لوگ ایسا کریں گے انہیں فوراً ہی فایدہ نظر آئے گا۔اس علاج سے بواسیر ،سخت سے سخت قبض ،پیچش، سنگرہنی۔ اسہال وغیرہ بیماریوں کو دور ہوتے میں نے خود دیکھا ہے۔''(۱۱)

آج ماحولیاتی آلودگی بہت زیادہ خطرناک صورت اختیار کرچکی ہے جس کی وجہ سے مختلف امراض بھی جنم لے رہے ہیں خاص طور پر نظام تنفس کی بیماریاں کثرت سے پیدا ہورہی ہیں ،مہاتما گاندھی نے صاف ہوا کی اہمیت اور افادیت پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے اسی طرح امراض معدہ میں قبض اسہال اور بواسیر وغیرہ بہت عام امراض ہیں۔ آج غذاؤں میں بڑھتے ہوئے نقصان دہ اجزاء اور اصلی غذاؤں کے نہ ملنے کی وجہ سے ہر شخص امراض معدہ سے دوچار ہے ان کے لئے مہاتما گاندھی کی یہ ہدایات،تدابیر اور علاج ومعالجہ اہم تحفہ ہیں۔

''اب ہمیں مندرجہ بالا امراض کے علاج پر غور کرنا چاہئے۔ان کا پہلا علاج تو یہ ہے کہ ان بیماریوں میں مبتلا شخص اپنی خوراک کم کردے۔بہت ثقیل غذا۔گھی،کھانڈ،ربڑی،ملائی کے زیادہ استعمال سے ہمیشہ پرہیز کریں۔ اگر بیڑی ،شراب،بھنگ وغیرہ پینے کی عادت ہوتو اسے ترک ہی کردینا چاہئے ۔میدہ کی روئی کھانے کی عادت ہوتو اسے بھی چھوڑ دیں۔ چائے،قہوہ اور کوکو سے پرہیز کریں۔

مہاتما گاندھی کی ایک اہم کتاب گرہست جیون یعنی مرد وعورت کے تعلقات ہیں اس کتاب میں مہاتما گاندھی ایک فرانسیسی کتاب جس کے مصنف شری پال بیورو تھے ہندی میں اس فرانسیسی کتاب کے نام کا مفہوم بھرشٹاچار یعنی بدمعاشی تھا مہاتما گاندھی نے اس کتاب کے خصوصی حوالہ اور دوسری کتابیں جن کا تعلق اس موضوع سے تھا ان کے مطالعہ کے بعد مرد وعورت کے تعلق پر یہ اہم کتاب لکھی ہے جس میں مانع حمل کے لئے مصنوعی طریقوں کا استعمال بتلایا گیا ہے برہم چاریہ ہونے پر بھی ابھارا گیا ہے الغرض مرد وعورت کے تعلقات پر یہ کتاب نہایت اہم ہے ہم صرف اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں شہوانی جذبات سے مغلوب ہوکر اپنی اہم قوت کو ضائع کردینے اور پھر اس قوت کے حصول کے لئے کشتہ جات اور مقویات استعمال کرنے اور حکیموں کے مطب کا چکر لگانے کا ذکر کیا گیا ہے مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

''قدرت نے جو پوشیدہ طاقتیں ہمیں عطا کی ہیں،ان کو دبا کر اپنے جسم میں ہی ان کو اکھٹا کرنا اور ان کا استعمال صرف اپنے جسم کیلئے ہی نہیں بلکہ دل ،دماغ اور عقل کی تندرستی بڑھانے میں کرنا چاہئے۔لیکن ہمارے اردگرد کیا نظارے دکھائی دیتے ہیں ۔چھوٹے بڑے عورت مرد سب کے سب نفس پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ایسے وقت میں پاگل بن جاتے ہیں۔ہماری عقل ٹھکانے نہیں رہتی ۔ہماری آنکھوں پر خواہشات کا پردہ پڑجاتا ہے ہم خواہشات نفسانی کے بس ہوکر اندھے ہوجاتے ہیں۔خواہشات نفسانی سے مغلوب عورت مردوں کو اور لڑکے لڑکیوں کو میں نے بالکل پاگل بن جاتے دیکھا ہے میرا ذاتی تجربہ بھی اس سے مختلف نہیں۔میں جب کبھی ایسی حالت میں ہوا ہوں۔اپنی شرم وحیا اور عزت کو بالکل بھول گیا ہوں۔ یہ چیز ہی ایسی ہے ۔اس طرح ہم ایک رتی بھر مواصلت کے لطف کے لئے ایک من طاقت ایک لمحہ میں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔جب نشہ اترتا ہے تو ہم کنگال بن جاتے ہیں۔دوسرے دن سویرے ہمارا جسم بھاری رہتا ہے ہمیں حقیقی شانتی نہیں ملتی۔ ہمارے جسم میں تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ہمارا دل ٹھکانے نہیں رہتا۔ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے ہم کڑاھی بھر بھر

کردودھ پیتے ہیں ،کشتہ کھاتے ہیں ۔مقوی ادویات استعمال کرتے ہیں اورحکیموں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں۔کیا کھانے سے اعضاء تناسل میں حرکت پیدا ہوگی؟ بس اس کی کھوج کرتے ہیں۔جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے۔ہمارے اعضا عقل اور دماغ ناکارہ ہوتے جاتے ہیں ۔اور بڑھاپے میں ہماری عقل تقریباً ماری جاتی ہے۔‘‘(۱۲)

آج ہمارے معاشرہ وسماج میں سوشل میڈیا، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن اور بیہودہ فلموں نے نوجوانوں کے جذبات بھڑکا رکھے ہیں ،شہوت رانی، زناکاری ،جنسی بے راہ روی کی صورت حال بے حد ابتر ہے مہاتما گاندھی کا یہ اقتباس آج کے سماج کی بخوبی عکاسی کرتا ہے اوران چیزوں سے بچنے اور محفوظ رہنے کی تدابیر کا بھی ان کی کتابوں اور مضامین کے ذریعہ پتہ چلتا ہے ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتی سطح سے لیکر عوامی سطح تک جس طرح ہم مہاتما گاندھی کی سچائی، حب الوطنی ،عدم تشدد اور امن وشانتی کے پیغام کو عام کرتے ہیں اسی طرح مہاتما گاندھی کے ان طبی اصول ونظریات، افکار وخیالات کو بھی حکومتی ذرائع خصوصاً سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا اور سماجی فلاح وبہبود کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے ذریعہ عوام تک پہونچائیں اسلئے کہ مہاتما گاندھی کی شخصیت ہندوستانی عوام کے لئے تعظیم واحترام کے لائق ہے انکی باتوں کو عوام غور سے سنتی ہے اوراس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

حکومت اورسرکاری ادارے ۲/اکتوبر کو بڑے بڑے پروگرام کے ذریعہ مہاتما گاندھی کے اصولوں آدرشوں افکار ونظریات اور تعلیمات کو بیان کرتے ہیں اگران پروگراموں میں مہاتما گاندھی کی طبی آراء کو بھی شامل کرلیا جائے تو ہم ایک صحت مند معاشرہ تشکیل دینے اورامراض سے پاک وصاف ملک بنانے میں کامیاب ثابت ہوسکتے ہیں۔مہاتما گاندھی کے طبی افکاروخیالات اصول ونظریات تجربات ومشاہدات اورآراء کی طبی معنویت عصر حاضر بھی اسی طرح برقرار ہے جس طرح مہاتما گاندھی کے زمانہ میں تھی۔

نیادور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

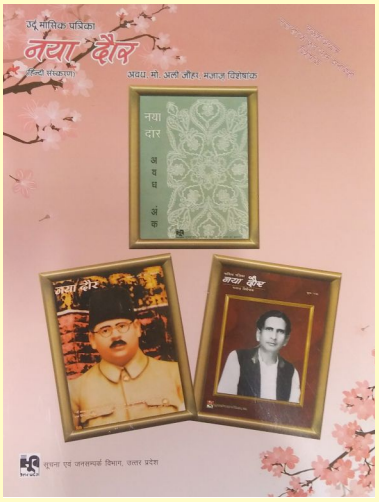

’نیادور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ’اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر‘ بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ’نیادور‘

{حوالہ وحواشی}

۱۔ خوراک اورصحت پرمیرے تجربات،مہاتما گاندھی ،نرائن سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لوہارگیٹ لاہور،ص۱۔۲

۲۔ رہنمائے صحت،مہاتما گاندھی ،مترجم محمد اعظم خاں،نصیرولاعثمان پورہ حیدرآباد دکن، ۱۹۳۰ء،ص۲۔۳

۳۔ شاہراہِ تندرستی،مہاتما گاندھی ،مترجم پروفیسر رام سروپ کوشل،لاجپت رائے اینڈسنز تاجران کتب لاہور،ص۱۳

۴۔ ایضاً،ص۱۵

۵۔ تحفظی وسماجی طب،حکیم انصاری محمد یوسف، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دریاگنج نئی دہلی،۲۰۰۹ء، ص۴۔۵

۶۔ شاہراہ تندرستی،مہاتما گاندھی ،مترجم پروفیسر رام سروپ کوشل، لاجپت رائے اینڈسنز تاجرانِ کتب لاہور،ص۱۱۔۱۲

۷۔ رہنمائے صحت،مہاتما گاندھی،مترجم محمد اعظم خاں،نصیرولاعثمان پورہ حیدرآباددکن،۱۹۳۰ء ،ص۱۱

۸۔ ایضاً،ص۶۴۔۶۵

۹۔ شاہراہِ تندرستی،مہاتما گاندھی ،مترجم پروفیسر رام سروپ کوشل،لاجپت رائے اینڈ سنز، تاجرانِ کتب لوہارگیٹ لاہور،ص۱۳۹

۱۰۔ خوراک اورصحت پرمیرے تجربات، مہاتما گاندھی،مترجم پروفیسررام سروپ کوشل، لاجپت رائے اینڈسنز تاجرانِ کتب لوہارگیٹ لاہور،ص۷۶

۱۱۔ ایضاً،ص۱۵۳۔۱۵۴

۱۲۔ گرہست جیون،مہاتما گاندھی ،نرائن دت سہگل اینڈسنز تاجرانِ کتب لوہارگیٹ لاہور، ص۸۶۔۸۷

❑❑❑

ڈاکٹر شاہ نواز فیاض
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
رابطہ: 9891438766

گاندھی جی اور ہندی اردو کا مسئلہ

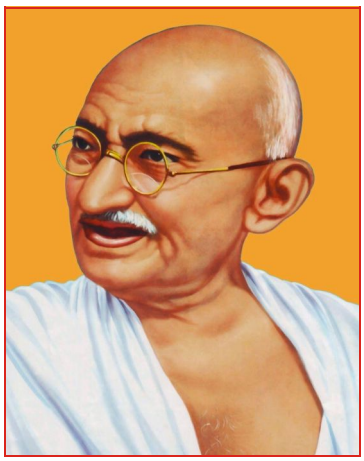

ہندوستانی سیاست کی تاریخ گاندھی جی کے بغیر مکمل نہیں گردانی جاسکتی۔ جنگ آزادی اور آزادی کی تاریخ ان کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی۔ انھوں نے بیک وقت کتنے اہم کارنامے انجام دیے۔ گاندھی جی از اول تا آخر ہندوستانی رہے۔ انھوں نے لوگوں کو مذہب کی عینک سے نہیں، بلکہ ہندوستانی سپوت کے طور پر دیکھا۔ گاندھی جی کے متعلق پڑھتے ہوئے اس بات کا بار بار احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کام کیا صدق دل سے کیا، اسی لیے بڑے بڑے کام انھوں نے بڑی آسانی سے کیے۔ تشدد کے بغیر کس طرح سے بڑے سے بڑا کام انجام دیا جاسکتا ہے، یہ درس گاندھی جی ہی نے دنیا کو دیا۔ آج دنیا ان کو اس عظیم کارنامے کی وجہ سے یاد کرتی ہے۔

گاندھی جی ہندوستانیوں کو کسی طرح بھی الگ الگ خیمے میں بنٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس انگریز کسی بھی صورت میں ہندوستانیوں کو بانٹنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بانٹ کر ہی وہ اپنی حکمرانی برقرار رکھ سکتے تھے۔ اس لیے گاندھی جی اور ان کے رفقا نے ہندوستانیوں کو کسی بھی طرح سے الگ نہیں ہونے دینا چاہ رہے تھے۔ اس تعلق سے گاندھی جی کی تقریریں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ پیغام میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تعلق سے بہت کچھ لکھا ہے۔ گاندھی جی کی دیگر کتابیں اسی ہندوستانیت کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ زبان کے تعلق سے جب بات ہوئی تو گاندھی جی نے جس مصلحت کا ثبوت دیا، وہ کسی سے مخفی نہیں رہا۔ 'ہندوستانی' اسی مصلحت کا دیا ہوا نام ہے۔ جہاں مقصد صرف اتحاد کا تھا۔ اس سلسلے میں اختلاف بہرحال کیا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت وہی زیادہ مناسب تھا، جو گاندھی جی نے کیا تھا۔ ہندی اور اردو سیاسی موضوع بن گیا تھا۔ اسی میں لوگوں کے مذہب تلاش کیے جانے لگے تھے، گو کہ وہ سلسلہ اب بھی برقرار ہے، لیکن اس شدت نے بہت نرمی اختیار کر لی ہے۔ گاندھی جی کی بیشتر تحریروں اور تقریروں کے مطالعے سے اس بات کا خاطر خواہ اندازہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ 'ہندوستانی' کے نام پر ہندی کی موافقت میں ہی اپنی بات رکھتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، اور لکھا بھی گیا ہے۔ زبان سے متعلق گاندھی جی نے جو کچھ لکھا یا اس موضوع پر انھوں نے جو تقریریں کی ہیں، اس کو عشرت علی صدیقی نے 'گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، جسے اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ نے ۱۹۸۰ میں شائع کیا۔

اس مضمون کو ترتیب دینے میں راقم کے پیش نظر یہی کتاب ہے۔

زبان کے معاملے میں گاندھی جی کا ماننا تھا کہ گجراتی بنگالی سیکھیں، بنگالی گجراتی سیکھیں۔ اسی طرح سے مسلم ہندی اور ہندو اردو سیکھیں۔ اور بھی دوسری زبان کو لیکر گاندھی جی کے یہی خیالات تھی؛ تا کہ پورا ہندوستان تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب آ سکے۔ لیکن یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ گجراتی، بنگالی، تمل اور اسی طرح سے دوسری زبان کو سیکھنے کے لیے انھوں نے کسی مذہب کی قید نہیں لگائی، لیکن ہندی اور اردو کے معاملے میں انھوں نے قید لگائی کہ مسلم کو ہندی اور ہندو کو اردو سیکھنی چاہیے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ گاندھی جی کے پیش نظر ہندی اور اردو زبان کے ساتھ ساتھ براہ راست اس کا تعلق مذہب سے بھی ہے۔ ان کے اس جملے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے جہاں ہر حال میں ہندوستانیوں کو متحد کرنا چاہ رہے تھے، وہیں انھوں نے اس طرح کے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ گاندھی جی نے کس طرح سے ہندی کی حمایت کی ہے، خود انھیں کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''ہر ایک پڑھے لکھے ہندستانی کو اپنی زبان کا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی کا، پارسی کو فارسی کا، اور سب کو ہندی کا گیان ہونا چاہیے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں کو پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانیوں کو تامل سیکھنی چاہیے۔ سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اردو یا ناگری لکھاوٹ میں لکھنے کی چھوٹ دینی چاہیے۔''

(گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ۔ مترجم، عشرت علی صدیقی۔ اتر پردیش اردو کاڈمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۰ ص، ۱۳)

مندرجہ بالا اقتباس میں ایک جملہ قابلِ غور ہے۔ 'سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اردو یا ناگری لکھاوٹ میں لکھنے کی چھوٹ دینی چاہیے۔' کیا دو رسم الخط میں کسی ایک زبان کا ہونا ممکن ہو سکے گا۔ مسئلہ رسم الخط کا زبان کے شناخت کے طور پر سب سے اہم ہے۔ ورنہ زبان تو ایک بیانیہ ہے۔ ہم جو بولتے ہیں رسم الخط اس کا عکس ہوتی ہے۔ اگر ہم نے ایک زبان کے لیے دو رسم الخط اختیار کیا تو کیا ہماری زبان کا وجود باقی رہے گا۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے تعلق سے جب پڑھتے ہیں تو اس بات کا احساس بالکل واضح طور پر ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومتیں کس طرح سے اپنی زبان کے تحفظ کے لیے پیسے خرچ کرتی ہیں۔ ایک سامنے کی مثال لے لیں کہ جرمن زبان کے بارے میں یہ کب سے کہا جارا ہے کہ یہ زبان مرجائے گی، لیکن وہاں کی حکومت اور عوام نے نہ صرف یہ کہ بول چال کی حد تک اسے باقی رکھا، بلکہ رسم الخط کے طور پر بھی اسے دنیا کے سامنے اس طرح سے پیش کیا کہ وہ آج دنیا کی مختلف جامعات میں کورس کا حصہ ہیں۔

ہندی اور اردو بول چال کی حد تک تو ایک معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان کا اصل فرق رسم الخط کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ اس متعلق گاندھی جی کا ایک خیال اور ملاحظہ فرمائیں:

''میں ہندی اس زبان کو کہتا ہوں جو اتر کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جسے یا تو دیو ناگری میں اور یا اردو لکھاوٹ میں لکھا جاتا ہے۔ اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی کیے گئے ہیں۔

ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اتری ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں ان زبانوں میں فرق پڑھے لکھے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ پڑھے لکھے ہندو اپنی ہندی میں سنسکرت ملا دیتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمان اسے سمجھ نہیں پاتے اسی طرح لکھنؤ کے مسلمان اپنی اردو میں فارسی ملا دیتے ہیں۔ اور اسے ہندو کے سمجھنے کے لائق نہیں رکھتے۔''

(ایضاً۔ ص، ۱۵-۱۶)

گاندھی جی کا یہ مضمون گجراتی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس مضمون کو انھوں نے ۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۷ کو دوسری گجرات تعلیمی کانفرنس میں بطور صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے گجراتی زبان کی فلاح و بہبود کے لیے کئی اہم نکات پیش کیے۔ لیکن اسی کے ساتھ گاندھی جی کا یہ کہنا کہ یہ دونوں زبانیں (ہندی اور اردو) ایک ہیں کسی بھی طور مناسب نہیں۔ اس بات پر غور کریں کہ اس وقت کیا مسلمان سنسکرت سے اس طرح سے ناواقف تھے کہ وہ پڑھے لکھے ہندوؤں کی زبان محض اس لیے نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں، یہ بات کسی بھی طرح سے قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے برعکس مسلمان وہ بھی خالص لکھنؤ کے مسلمان اپنی زبان میں چند عربی و فارسی کے الفاظ ملا دیتے تھے، جو ہندوؤں کی سمجھ سے بالا ہو جاتی تھی، ایسا اس لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہندو فارسی زبان و ادب میں مکمل دسترس رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے کام کسی سے بھی مخفی نہیں۔

ہندی اور اردو کے مسئلے پر گاندھی جی کا نظریہ واضح طور پر (اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے دوسرے اجلاس میں جو ۱۹۳۷ میں مدراس میں منعقد کیا گیا تھا۔) ان (گاندھی جی) کے صدارتی خطبے میں بہت کچھ واضح طور سامنے آ گیا تھا۔ اس صدارتی خطبے کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

''کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہم بھی یورپ کی رومن لکھاوٹ کو اپنا لیں، لیکن پھر بحث مباحثے کے بعد یہ رائے بن چکی ہے کہ ہماری

مشترکہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہوسکتی ہے اور کوئی نہیں۔ اردو کو اس کا رقیب بتایا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اردو یا رومن کسی میں بھی دیسی کا ملیت اور صوتی (آواز پیدا کرنے والی) صلاحیت نہیں ہے جیسی دیوناگری میں ہے۔ یاد رکھیے کہ آپ کی مادری زبانوں کے خلاف میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ تامل، تیلگو، ملیالم، کنڑ تو ضرور رہنی چاہیے اور رہے گی۔ لیکن ان صوبوں میں ان پڑھ لوگوں کو ان زبانوں کے ادب کی تعلیم دیوناگری لکھاوٹ کے ذریعہ کیوں نہ دیں؟ ہم قومی ایکتا حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی خاطر دیوناگری کو مشترکہ لکھاوٹ مان لینا چاہیے۔''

(ایضاً۔ص،۶۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ گاندھی جی مادری زبان کے طور پر یقیناً آزادانہ گفتگو کی ہے، لیکن قومی زبان کے سلسلے میں ان کی رائے بالکل واضح ہے کہ وہ دیوناگری رسم الخط پر زور دیتے ہیں۔ 'ہندوستانی' کے نام پر گاندھی جی نے بہت واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ مشترکہ لکھاوٹ جسے 'ہندوستانی' کا نام دیا گیا، لیکن اس کے پس پشت دیوناگری رسم الخط کی تائید کی ہے۔ ہندوستانی کی تائید کئی اہم لوگوں نے کی ہے، جس میں سید سلیمان ندوی کا نام بطور خاص پیش کیا جاسکتا ہے۔ مشترکہ لکھاوٹ میں ایک سوال یہ ضرور قائم ہوگا کہ دنیا کی وہ کون سی زبان ہے، جس کے دو رسم الخط ہوتے ہوئے دونوں کو اولیت حاصل ہو؟ اس کی واحد مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی۔ کیوں کہ زبان سیکھنے والا کسی ایک ہی رسم الخط کو سیکھے گا۔ ایسے اور اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں، جو ذہن میں بار بار ابھرتے ہیں۔ کیوں کہ رسم الخط کو مذہب سے جوڑ کر دیکھا گیا، ایسے یہ زبان سے زیادہ مذہبی مسئلہ بن جائے گا۔ گاندھی جی نے اس سلسلے میں جو گفتگو کی ہے، وہ یقیناً مایوس کن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب نظریۂ ہندوستانی کتابوں کی زینت بن گیا، عام و خاص استعمال میں اس لفظ کی حیثیت محض تاریخی ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

گاندھی جی کا ایک مراسلہ 'ہریجن ۱۶/مئی ۱۹۳۶' میں شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے دیوناگری کی ایک تحریک سے خود کو وابستہ کرلیا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''.....اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دیوناگری کی ایک تحریک سے میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر وابستہ کردیا ہے اور وہ تحریک یہ ہے کہ اسے مختلف صوبوں میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی، خاص کر ان زبانوں کی جن کے لغت میں سنسکرت لفظ زیادہ ہیں، مشترکہ لکھاوٹ بنا دیا جائے، بہ ہرحال اس بات کی کوشش ہورہی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے بیش بہا ذخیروں کو دیوناگری لکھاوٹ میں منتقل کرلیا جائے۔''

(ایضاً۔ص،۷۵)

گاندھی جی قول کے مطابق وہ مشترکہ لکھاوٹ کی اہمیت سے لوگوں کو آشنا کررہے ہیں، لیکن ان کے کسی بھی جملے سے اس بات کی وضاحت نہیں ہورہی ہے کہ وہ مشترکہ لکھاوٹ کے حامی ہیں۔ انھوں نے خود کو دیوناگری کی ایک تحریک سے جب وابستہ کرلیا تو ایسے میں اس کا امکان کہاں رہ جاتا ہے کہ جس تحریک سے وابستہ ہوئے ہیں، عملاً اس کے برعکس ہوں۔ اس تعلق سے بہت سے حوالے دیے جاسکتے ہیں کہ گاندھی جی نے مشترکہ لکھاوٹ یا ہندوستانی کے نام پر دیوناگری کی تائید کرتے رہے۔ ایسے میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کا خواب تو دیکھا جاسکتا ہے، لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ گاندھی جی کی اس سلسلے میں مخالفت نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں نے مراسلے کے ذریعے اس نظریے کی خوب مخالفت کی ہے۔ جس کا گاندھی جی نے جواب بھی دیا، لیکن ظاہر ہے کہ وہ جواب محض جواب ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس جواب میں یقین جیسی بات مفقود ہے۔

گاندھی جی اردو ہندی کے پیچیدہ مسئلہ سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ اردو اور ہندی کے اہم نثر نگار وشاعر سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ اس ایک مثال ملاحظہ ہو:

''۱۹۳۵ میں جب میں دوبارہ سمّیلن کا صدر بنا تو میں نے 'ہندی' لفظ کی یہ تشریح کرائی کہ ہندی وہ زبان ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔ ایسا کرنے میں میرا مقصد یہ تھا کہ میں ہندی میں مولانا شبلی کی سلیس اردو اور بابو شیام سندر داس کی سلیس ہندی دونوں کو شامل کردوں۔''

(ایضاً۔ص،۹۰)

مندرجہ بالا گاندھی جی کے خیالات سے اس بات کی وضاحت صاف ہوجاتی ہے کہ انھیں مولانا شبلی اور بابو شیام سندر داس کے انداز تحریر اور رسم الخط کے مابین جو واضح فرق تھا، اس سے گاندھی جی بخوبی واقف تھے۔ گاندھی جی بار بار یہ بات کہتے ہیں کہ ہندی سے مراد وہ زبان ہے، جو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے، اس سے مراد ایک ہی زبان ہے۔ لیکن پھر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر گاندھی جی ان دونوں رسم الخط سے ایک زبان مراد لیتے ہیں تو دیوناگری کی تشہیر کے ساتھ ساتھ اس کی حمایت بھی واضح انداز میں کیوں کرتے ہیں؟ شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں نے ان کے اس نظریے پر شک کا اظہار کیا تھا۔

گاندھی جی نے زبان کے مسئلے پر مشن کے طور پر کام کیا۔ قومی زبان بنانے کے لیے انھوں نے دیوناگری کی کھل کر حمایت کی۔ اس کی ایک مثال ان کی وہ تقریر ہے، جو انھوں نے 'راشٹر بھاشا پر چار سمیتی کے

ٹیچرس ٹریننگ اسکول وردھا ٹریننگ پانے والوں کے سامنے ۲۴/ستمبر ۱۹۳۹ میں کی تھی۔ اس تقریر کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

''راشٹر بھاشا ابھی بنی نہیں ہے۔ ابھی تو اس کا جنم ہی ہوا ہے۔ ہندی میں ابھی تک ایسی کافی کتابیں نہیں ملتیں جن کے ذریعہ سائنس وغیرہ جیسے مضمونوں کو پڑھایا جا سکے۔ ہاں بنگلا اور اردو میں کچھ ایسی کتابیں تیار ہوئی ہیں۔ لیکن بنگلا سے بھی زیادہ ترقی اردو زبان نے کی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ ان لوگوں نے اس کام پر لاکھوں روپیہ خرچ بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں اونچے سے اونچے درجوں میں سائنس جیسے مشکل مضمونوں کی بھی تعلیم اردو کی معرفت دی جاتی ہے۔ ہندی میں ابھی ایسا نہیں ہوا ہے۔''

(ایضاً۔ص،۱۱۱)

مندرجہ بالا جملوں پر غور کریں صاف معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے اردو ہندی کو الگ الگ خانے میں رکھا۔ انھوں نے بھی پس پردہ دونوں کو الگ الگ زبان مانا اور سمجھا۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا جملوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی نے ہندی ہندوستانی کی جو بات کی تھی، اس کے پیچھے ایک مقصد یہ بھی کارفرما تھا کہ کہیں لوگوں کے دباؤ میں انگریزی قومی زبان کا درجہ نہ حاصل کر لے۔ انگریزی زبان و ادب کی اہمیت سے انھوں نے انکار نہیں کیا، لیکن انھیں یہ منظور نہیں تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہماری قومی زبان بنے۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''.....کچھ لوگوں میں دوسری غلط فہمی یہ دیکھی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہندی کو انگریزی زبان کی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ کچھ تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ انگریزی ہی قومی زبان بن سکتی ہے اور بن بھی گئی ہے۔

اگر ہندی انگریزی کی جگہ لے تو کم سے کم مجھے تو اچھا ہی لگے گا لیکن انگریزی زبان کی اہمیت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ آج کل کے علم کو حاصل کرنے، آج کل کے ادب کے مطالعے، ساری دنیا کی جانکاری، روپے پیسے کی کمائی، سرکاری افسروں کے ساتھ تعلق رکھنے اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے ہمیں انگریزی کے علم کی ضرورت ہے۔ خواہش نہ رکھتے ہوئے بھی ہم کو انگریزی پڑھنی ہوگی۔ یہی ہو بھی رہا ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے۔ لیکن انگریزی قومی زبان کبھی نہیں بن سکتی۔''

(ایضاً۔ص،۵۵)

گاندھی جی نے ہندوستان اور ہندوستانیت کا جو خواب دیکھا تھا، اسے کسی بھی طرح سے خلط ملط نہیں ہونے دینا چاہ رہے تھے۔ چونکہ زبان سب سے بڑا ذریعہ ہے، اپنے خیالات کے اظہار کے لیے۔ ایسے میں قومی زبان کے طور پر انگریزی کو قبول کر لیا گیا ہوتا تو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے یقیناً ہندوستان کمزور ہو گیا ہوتا، جب کہ دنیا بھر میں یہ ملک اپنے اسی تہذیبی رویے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کو قومی زبان بنانے کے اپنے کچھ فائدہ بھی ہوتے، لیکن گاندھی جی نے اپنی میراث کو سب فائدوں سے اوپر رکھا۔ اسے یقیناً ان کے جذبات سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

ہندی اور اردو کا مسئلہ صرف زبان کی حد تک ہی نہیں تھا، بلکہ اسے سیاسی، سماجی اور مذہبی تناظر میں بھی دیکھا گیا۔ جس کی وجہ سے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ جس ملک میں اتنی ساری زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کے باوجود لوگ ایک دوسرے سے قریب ہیں تو کیا ضرورت تھی کہ اردو پر کسی دوسرے رسم الخط (دیوناگری) کو ترجیح دی جائے۔ جب کہ اس وقت اردو

گاندھی جی ہندوستانیوں کو کسی طرح بھی الگ الگ خیمے میں بٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس انگریز کسی بھی صورت میں ہندوستانیوں کو بانٹنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بانٹ کر ہی وہ اپنی حکمرانی برقرار رکھ سکتے تھے۔ اس لیے گاندھی جی اور ان کے رفقا نے ہندوستانیوں کو کسی بھی طرح سے الگ نہیں ہونے دینا چاہ رہے تھے۔

اس تعلق سے گاندھی جی کی تقریریں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ پیغام میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تعلق سے بہت کچھ لکھا ہے۔ گاندھی جی کی دیگر کتابیں اسی ہندوستانیت کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ زبان کے تعلق سے جب بات ہوئی تو گاندھی جی نے جس مصلحت کا ثبوت دیا، وہ کسی سے مخفی نہیں رہا۔

'ہندوستانی' اسی مصلحت کا دیا ہوا نام ہے۔ جہاں مقصد صرف اتحاد کا تھا۔ اس سلسلے میں اختلاف بہر حال کیا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت وہی زیادہ مناسب تھا، جو گاندھی جی نے کیا تھا۔ ہندی اور اردو سیاسی موضوع بن گیا تھا۔ اسی میں لوگوں کے مذہب تلاش کیے جانے لگے تھے، گو کہ وہ سلسلہ اب بھی برقرار ہے، لیکن اس شدت نے بہت نرمی اختیار کر لی ہے۔ گاندھی جی کی بیشتر تحریروں اور تقریروں کے مطالعے سے اس بات کا خاطر خواہ اندازہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ 'ہندوستانی' کے نام پر ہندی کی موافقت میں ہی اپنی بات رکھتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور لکھا بھی گیا ہے۔ زبان سے متعلق گاندھی جی نے جو کچھ لکھا یا اس موضوع پر انھوں نے جو تقریریں کی ہیں، اس کو عشرت علی صدیقی نے 'گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، جسے اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے ۱۹۸۰ میں شائع کیا۔

زبان کئی اعتبار سے ہندی سے بہت آگے تھی، جس کا ذکر پچھلے صفحہ میں کیا جا چکا ہے۔

ہریجن سیوک ۱۴ / جولائی ۱۹۴۶ میں گاندھی جی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے بھائی رام نریش ترپاٹھی کے ایک خط کا کچھ حصہ بھی شائع کیا ہے، جس کے جملوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بھائی رام نریش ترپاٹھی اردو کو ہندی کے مقابلے میں زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں انھوں نے لکھا ہے:

''میں نے اس دن کہا تھا کہ اردو ہندی سے زیادہ صاف ستھری ہے۔ اس کی ایک مثال لکھتا ہوں۔ ہندی کے ایک مشہور لیکھک کا یہ جملہ ہے: ''سمجھ میں نہ آنے سے گھبراہٹ سی لگنے لگتی ہے۔'' اردو میں گھبراہٹ ''لگتی'' نہیں ''ہوتی'' ہے یا پیدا ہوتی ہے۔ اردو کا کوئی مشہور لیکھک کبھی غلط محاورہ نہیں لکھے گا۔ اور اگر لکھ دے گا تو اس کو زبردست مورچہ لینا پڑے گا۔ ہندی میں بھاشا کو سدھارنے کی کوئی تحریک ہی نہیں ہے۔ دراصل کوئی تحریک شروع کرنے کے بجائے اردو زبان کی کتابیں یا مضمون ہندی حرفوں میں چھپنے لگیں تو ہندی زبان کا بہت زیادہ بھلا ہوگا۔ اردو زبان کے سدھارنے اور سنوارنے میں اردو کے شاعروں اور لیکھکوں نے پچھلے کئی برسوں میں جو ہاتھا پائی کی ہے اس کا فائدہ ہندی بھاشا کو آسانی سے مل جائے گا۔ اور اس استعمال سے وہ آپ سے آپ ہندوستانی بھی بن جائے گی۔''

(ایضاً۔ص،۱۹۶)

یہاں بھائی رام نریش ترپاٹھی سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے لکھا ہے ''اردو زبان کے سدھارنے اور سنوارنے میں اردو کے شاعروں اور لیکھکوں نے پچھلے کئی برسوں میں جو ہاتھا پائی کی ہے اس کا فائدہ ہندی بھاشا کو آسانی سے مل جائے گا۔'' یہاں انھوں نے پچھلے کئی برسوں کا ذکر کیا ہے، جب کہ اردو میں اصلاح زبان کا معاملہ شیخ ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹-۱۷۹۱) نے اٹھایا تھا، زبان کی باریکیوں، تذکیر وتانیث اور دیگر مباحث پر ان کا رسالہ بھی ملتا ہے۔ اس کے بعد عہد ناسخ سے لیکر جلال لکھنوی تک اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایسے میں اصلاح زبان کے تعلق کئی برسوں کا ذکر سورج کو روشنی دکھانے مترادف ہے۔ لیکن انھوں نے اردو زبان کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن گاندھی جی نے ان خصوصیات کو جانتے ہوئے بھی ہندی کی حمایت کی۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے تناظر میں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ گاندھی جی نے زبان کے مسئلے میں جس طرح کی گفتگو کی ہے، وہ 'ہندی ہندوستانی' کے نام پر دیوناگری کی حمایت کی ہے۔ انھوں نے بلاشبہہ یہ بات کہی ہے کہ ہندی ہندوستانی سے مراد وہ زبان ہے، جسے یہاں کے باشندے آسانی سمجھ سکیں اور جو مشترکہ لکھاوٹ میں لکھی جائے لیکن اس کے پس پردہ انھوں نے رسم الخط کے سلسلے میں دیوناگری کی حمایت کی۔

اسی لیے گاندھی جی کے 'ہندوستانی' والے نظریے کو لوگوں نے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ اس معاملے میں گاندھی جی کو لوگوں کی تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا؛ باوجود اس کے ان کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں وہ لوگوں کی تائید حاصل کرنے میں بہت حد تک ناکام رہے۔ اسی لیے آج مشترکہ لکھاوٹ یا ہندوستانی کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے جو محرک کارفرما تھے، اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے، جو تفصیل طلب ہے۔ نظریۂ ہندوستانی گاندھی جی کے جذبات کا ایک حصہ ہے، اس کو اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

❑❑❑

اطلاع

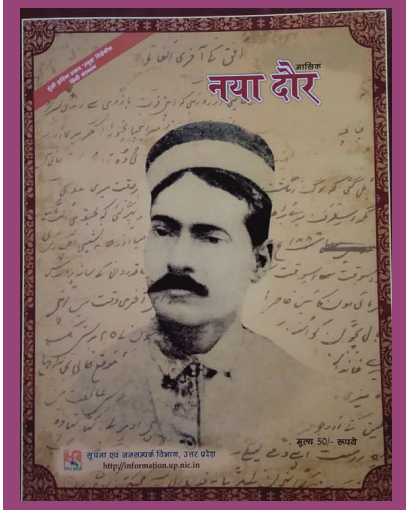

ادارہ ''نیادور'' کی جانب سے شائع ہونے والے ''خمار بارہ بنکوی'' اور ''منشی دواریکا پرشاد افق لکھنوی'' نمبراب دیوناگری رسم الخط میں بھی دستیاب ہیں۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۵۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۱۰۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

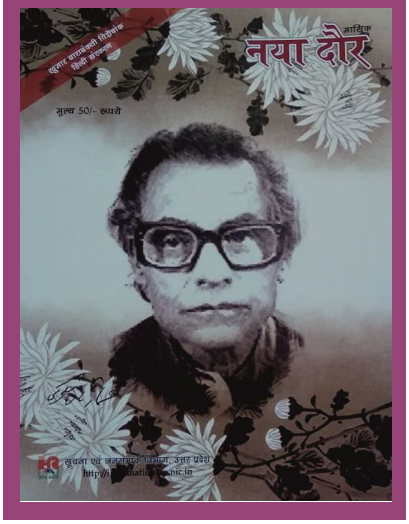

اشتیاق احمد
ریسرچ اسکالر، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
رابطہ: 9013350490

مہاتما گاندھی: اردو شاعری کے آئینہ خانے میں

ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ الفت دی
قاتل کو بھی گو لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی
'ہنسا' کو 'اہنسا' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں ''اک پریم سندیسہ'' لایا تھا

(آنند نرائن ملّا)

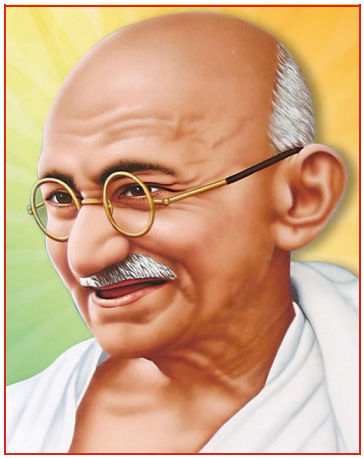

اردو شاعری برصغیر کی تہذیبی، ثقافتی، روحانی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی مسائل و موضوعات کی ترجمان رہی ہے۔ اس کا مزاج شروع سے ہی انسان دوستی کا پاسدار، سیکولر سوچ کا حامی، رواداری اور وسیع القلبی کا متحمل رہا ہے۔ جہاں اس میں بادشاہوں کے قصائد ہیں تو وہیں اس میں عام انسانوں کے احساسات وجذبات کی ترجمانی بھی جلوہ فگن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اردو شاعری میں تحریک آزادی کے متوالوں، مجاہدوں اور اجتہادیوں کے کارناموں نیز ان کی شجاعت کا تذکرہ بھی فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ حصول آزادی کے لئے محاذ قائم کرنے اور عوام کو متحد کرنے میں اردو زبان وادب اور بالخصوص اردو شاعری کا غیر معمولی کردار رہا ہے، جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

انگریزوں نے جب مہاتما گوتم بدھ، مہاویر جین، رام چندر اور صوفیوں کی اس سرزمین پر ظلم وستم، جبر واستبداد، نفرت وعداوت اور فرقہ وارانہ فسادات برپا کئے تو ان کے خلاف اردو شاعری نے عوام کے لہو کو گرمانے کا کام بحسن خوبی انجام دیا۔ اردو شاعری نے آزادیٔ ملک کے پروانوں کی حوصلہ افزائی کی، ان کے افکار وخیالات اور پیغامات کو عام کیا جن میں موہن داس کرم چند گاندھی کا نام سرِ فہرست ہے۔ سید احتشام حسین رقم طراز ہیں:

''عقیدت اور سوجھ بوجھ کی کیفیت لئے ہوئے اردو کے شعراء گاندھی جی کی ذات اور شخصیت، فلسفہ اور پیام کا ذکر کرتے رہے۔ اردو زبان کے پرستاروں نے اپنی زبان کے ذریعے سے مہاتما گاندھی کی زندگی اور پیام کو سمجھنے اور اس کی اشاعت کرنے کا فرض کسی نہ کسی حد تک ضرور انجام دیا ہے''۔

(حسین، سید احتشام؛ روایت اور بغاوت، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اردو، طبع سوم 1972، ص-236244)

اردو شعراء نے گاندھی جی کے زمانے میں ہی ان کے اصولوں اور پیغامات کو عام کیا۔ بعد کے شاعروں نے بھی ان کے افکار و خیالات کو فروغ دیا ہے۔

ہندوستان کی جن شخصیات نے عالمی منظر نامے پر اپنی شناخت قائم کی ان میں گاندھی جی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ 2/اکتوبر 1869 کو گاندھی جی گجرات کے پور بندر میں پیدا ہوئے۔ ان کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ان کا فلسفہ عدم تشدد تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ عدم تشدد دنیا کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ اس کی تعلیم ہر مذہب دیتا ہے لیکن گاندھی جی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اس کو پیش کیا اور اس کا استعمال کیا وہ قابل تحسین و آفریں ہے۔ اسی کی مناسبت سے ہر سال 2/اکتوبر کو 'عالمی یوم تشدد' منایا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی جیسی قد آور اور نابغہ روزگار شخصیت برسوں گردشِ فلک کے بعد ظہور میں آتی ہے۔ امسال گاندھی جی کی سالِ پیدائش کو ڈیڑھ سو برس ہو رہے ہیں۔ اس خاص موقع کو یادگار بنانے کے لئے سرکار مختلف سطحات پر کوشاں ہے۔ کئی ساری اسکیموں اور پروگراموں کے اہداف بھی اسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں کہ جب ہم ان کا 150/واں یوم ولادت منائیں تو ان کے خوابوں کی تعبیر بھی ان میں جلوہ گر ہو۔ اس سلسلے میں 'سوچھ بھارت ابھیان' پروگرام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شخصیت پر سیمینار کا انعقاد بھی کیا جا رہا ہے تاکہ گاندھی جی کے افکار و نظریات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بہم پہنچایا جا سکے اور ان سے نئی معنویت اور روشنی حاصل کی جا سکے۔ ان پر عمل پیرا ہو کر ملک گاندھی جی کے چاہے ہوئے بھارت کو پانا چاہتا ہے۔ جب ہم گاندھی جی کے خوابوں کا بھارت بنائیں گے تو یہی اس ملک کا ان کے لئے سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا۔

تحریک آزادی کی لڑائی میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے گاندھی جی کو اپنا اور اپنے ملک کا رہنما تسلیم کیا تھا۔ اس زمانے میں اگر کسی ایک شخص کو پورے برصغیر کا نمائندہ اور رہبر کہا جا سکتا ہے تو یقیناً وہ کرشمائی شخصیت گاندھی جی کی ہی تھی۔ اسی مناسبت سے اکبرؔ الہ آبادی نے کہا تھا:

انقلاب آیا ، نئی دنیا ، نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا، اب دورِ گاندھی نامہ ہے

اکبرؔ الہ آبادی کو گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات سے گہری انسیت تھی۔ انہوں نے گاندھی کی گوپیوں میں شامل ہونے کی تمنا بھی ظاہر کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آگے بڑھ کر گاندھی جی کا ہاتھ تھامیں اور ان کے عزائم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں تعاون دیں۔

عدم تشدد (اہنسا) اور ستیہ گرہ گاندھی جی کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 'ظلم کو ظلم سے مٹاؤ گے تو مٹ جاؤ گے'۔ گاندھی جی کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ انگریزوں کے مظالم کا علاج ستیہ گرہ اور عدم تشدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ برطانیہ کا دنیا کے وسیع و عریض خطے پر تسلط قائم تھا جس کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا تھا کہ ان کے مقبوضہ علاقوں میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی طاقت کو تشدد کی بنیاد پر چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے بہت زیادہ وسائل و ذرائع درکار تھے۔ برصغیر کی عوام کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے کھانا تک میسر نہ تھا بھلا دیگر وسیلے اور اسباب تک رسائی کیوں کر ممکن تھی، جس کی بدولت اتنی بڑی طاقت سے ٹکرایا جا سکتا تھا۔ اگر اس کے لئے تشدد یا جنگ کا راستہ کسی طرح (جو کہ ممکن نہ تھا) بڑے پیمانے پر اپنایا بھی جاتا تو یقیناً اس کے لئے بہت بڑی تعداد میں قربانی دینی پڑتی اور بے شمار لوگ کشت و خون کی نذر ہو جاتے۔ یہ گاندھی جی کو قطعی پسند نہ تھا۔ گاندھی جی نے جس طرح عدم تشدد اور ستیہ گرہ کو بنیاد بنا کر سامراجی طاقت کا سامنا کیا اس کے لئے وہ یقیناً لائق تحسین و ستائش ہیں۔ اس سلسلے میں آر۔سی۔ مجمدار لکھتے ہیں:

> لوگوں کو ایسے لیڈر کا انتظار تھا جو ان کو ٹھوس پروگرام دے اور اس پر عمل کرنے کی راہ سجھائے۔ اجتماعی طور پر مسلح جدوجہد ممکن نہ تھی۔ تب ستیہ گرہ ہی واحد راستہ تھا۔
>
> (بحوالہ سید احمد؛ اردو شاعری کا انقلابی کردار (دوسرا ایڈیشن)، ممبئی؛ پرنٹ میڈیا، 2003، ص171)

معاشی اور مادی وسائل نیز ہتھیاروں اور تشدد کے بغیر گاندھی جی نے جس بے باکی اور حوصلہ مندی سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اس کی نظیر کہیں اور بمشکل ہی ملے گی۔ بقول سید احتشام حسین ''حق اور عزت کے لئے نئی طرح کی جدوجہد نے دنیا کی آنکھیں ان کی طرف پھیر دیں۔'' گاندھی جی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے قول و فعل میں دوئی نہیں بلکہ حیرت انگیز حد تک وحدت پائی جاتی ہے۔ عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے بارے میں ان کے جو بھی افکار و خیالات تھے ان پر عمل درآمد کر کے انھوں نے جم غفیر کو متاثر کیا۔ وہ جو کچھ بھی کہتے پہلے پہل اس کو عملی جامہ پہنا کر دکھاتے بھی۔ پنڈت آنند نرائن ملاؔ نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:

تو نے یہ سبق خدمت قومی کا سکھایا
جو لب سے کہا پہلے اسے کر کے دکھایا
یوں عشق زبانی تو بہت سب نے جتایا
ہاں وقت پڑا جب تو تو ہی سامنے آیا
تیرا سا ہمیں چاہنے والا نہ ملے گا
ہمت کا دھنی قول کا سچا نہ ملے گا

عدم تشدد پر گاندھی جی تا عمر ڈٹے رہے، اس سے ان کی ثابت قدمی، سلامت روی اور اولعزمی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ 'عدم

تعاون' کی تحریک کے دوران جب عوام نے ہنسا کا راستہ اختیار کیا تو اس کے چلتے گاندھی جی نے اس تحریک کے اختتام کا اعلان کردیا۔ملک کی آزادی جیسے پاک جذبے کے لئے وہ تشدد کو انتہائی غلط مانتے تھے۔اصول سے بغاوت ان کا شیوہ نہ تھا۔وہ ''ینگ انڈیا'' میں لکھتے ہیں:

''میں ہر قسم کا جبر، ہر فریب، ہر اذیت کو برداشت کرسکتا ہوں۔یہاں تک کہ اپنی موت کو پسند کرسکتا ہوں لیکن آندولن متشدد ہوجائے یہ برداشت نہیں کرسکتا''۔

(بحوالہ راجیو اہیر؛ بھارت کا اتہاس، نئی دہلی؛ اسپیکٹرم بکس پرائیویٹ لمیٹیڈ، 2017، ص357)

ظفر علی خاں کی نظم ''گاندھی کا ترانہ'' ان کے نظریۂ عدم تشدد، ستیہ گرہ، مستقل مزاجی، حوصلہ مندی اور پامردی کی عمدہ ترین عکاس وترجمان ہے۔شاعر نے ان کی تمام تر خصوصیات اور اوصاف کو اس میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اشعار دیکھیں:

یہ فرنگیوں سے کہدو کہ میں ہوں دھرم کی مورت
جو کریں گے وہ عداوت تو میں آشتی کروں گا
کبھی اپنی آتما سے نہ میں دشمنی کروں گا
نہ بسوں گا جا کے بن میں نہ میں خودکشی کروں گا
ہے مرادھرم اہنسا، ہے اسی میں سب کی مکتی
مرے پاس ہے جو ہنڈی اسے درشنی کروں گا

جمیل مظہری کہتے ہیں:

بنا کے جس نے اہنسا کو جنگ کا آلا
ملوکیت کا مزاجِ کہن بدل ڈالا

اس ضمن میں اکبرؔ الہ آبادی کا یہ شعر بھی گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا برملا اظہار کرتا ہے:

لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہئے

اسی طرح کی حوصلہ مندی، جرأت مندی اور صبر وتحمل کا تقاضا گاندھی جی عوام سے کرتے تھے۔کسی بھی طریقے کا تشدد ان کے نزدیک قابل قبول نہ تھا۔قیام افریقہ کے دوران انھوں نے پہلے پہل عدم تشدد، سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کے حربوں کا استعمال کیا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔جب ہندوستان میں 1917 میں 'بال گنگا دھر تلک' اور 'اینی بیسنٹ' کی سربراہی میں 'ہوم رول تحریک' کا آغاز ہوا تب بڑے پیمانے پر سیاسی رہنماؤں کو قید کیا گیا۔انھیں قسم قسم کی اذیتیں دی گئیں۔ان پر طرح طرح کی صعوبتوں کے پہاڑ ٹوٹے۔مگر عوام میں گاندھیائی افکار ونظریات سرایت کرنے لگے تھے۔جس کی جانب اشارہ چکبستؔ کے ان اشعار میں ملتا ہے:

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا ہے ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ان اشعار میں گاندھیائی افکار ونظریات کا پرتو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ان میں عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا پورا منظر نامہ نظر آتا ہے۔ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کرنا، بخوشی قید و بند کا برداشت کرنا، اپنے مقصد پر اڈگ رہنا اور زبان پر سچائی کے نغمے سجائے رکھنا یہ سب گاندھی جی کے فکر ونظر کی تائید کرتے ہیں۔

گاندھی جی سیاسی وسماجی رہنما کی حیثیت سے ہندو مسلم اتحاد میں پختہ یقین رکھتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد سے ہی برطانوی حکومت پر کاری ضرب لگائی جاسکتی ہے۔اجتماعی طور پر مسلمانوں نے ملک کی آزادی میں جو جوش 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں دکھایا تھا بعد میں اس طرح کے جذبے سرد مہری کا شکار ہوگئے۔اس کی کئی وجوہات رہی ہیں۔ان میں ایک سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان ہی سب سے زیادہ انگریزی حکومت کے عتاب اور خفگی کا شکار ہوئے۔بڑے پیمانے پر علمائے دین اور سیاسی سرگرمیوں میں فعال اشخاص کو سرعام تختہ دار کے حوالے کیا گیا، ان کی ملکیت پر جبراً قبضہ کیا گیا۔یہ وہ قہر تھا جس کی بنا پر مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور معاشی سطح پر بہت زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے۔اس کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ حصول آزادی کے لئے جن ذرائع کا استعمال کیا گیا ان سے مسلمانوں میں عدم اطمینان کی صورت پیدا ہوئی۔خاص طور پر تحریک آزادی میں مذہبی رنگ کی شمولیت مسلمانوں کے لئے تشویش کا باعث بنی۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں حصول آزادی کا جذبہ نہیں تھا۔اتنا سب کچھ سہنے کے باوجود بھی مسلمانوں نے دیگر اقوام ومذاہب کے شانہ بہ شانہ تحریک آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔'خلافت آندولن' اور 'عدم تعاون تحریک' میں مسلمان بڑی تعداد میں اور بڑے جوش و خروش سے شامل ہوئے۔بقول گوپی چند نارنگ ''تحریک خلافت کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے قومی جد وجہد میں بڑی وسعت اور شدت آگئی تھی''۔عدم تعاون تحریک اور خلافت آندولن کے سربراہ اور رہنما گاندھی جی تھے۔گاندھی جی کی بدولت ہی ہندو اور مسلمان نے کندھے سے کندھا ملا کر انگریزوں کو چیلنج کیا۔حالانکہ اس کی وجہ سے ان پر اعتراضات بھی ہوئے۔انھیں اس بات پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ انھوں نے مذہبی مسئلہ کو آزادی کی لڑائی میں کیوں مدغم کیا جو کہ کانگریس کے اصول کے برخلاف تھا۔دراصل کانگریس سیشن کے اجلاس میں باضابطہ طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا

تھا کہ کانگریس پارٹی مذہبی مسائل و معاملات کو نہیں اٹھائے گی۔سلطنت عثمانیہ کی بربادی کے پس پشت چوں کہ انگریزوں کا ہی ہاتھ تھا اسی لئے گاندھی جی اسے موقعۂ غنیمت سمجھ کر مسلمانوں کی اجتماعی حصہ داری کو یقینی بنانا چاہتے تھے۔ظفر علی خاں کے اشعار یہاں نقل کرنا موزوں ہوگا:

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کردیا
شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد
گویا انھیں دو قالب و یک جان کردیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کردیا

اس سلسلے میں پنڈت آنند نرائن ملاؔ کا یہ شعر بھی قابل توجہ ہے:

تو معنیٔ انساں ہے حمیت کی ہے تصویر
تو شرح محبت کی اخوت کی ہے تفسیر

گاندھی جی لبرل فکر کے نمائندہ تھے۔لیکن ان کی لبرل سوچ مغرب سے کم اور مشرقی روایات وعقائد سے زیادہ غذا حاصل کرتی ہے۔بھگوت گیتا کے ساتھ ساتھ بودھ ازم،جین دھرم اور مسلم مذہب سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔یہی سبب ہے کہ گاندھی جی ہر مذہب وملت کو ایک ساجھا پلیٹ فارم عطا کرنے میں کامیاب رہے۔ہندو مسلم اتحاد کے سیاق میں گاندھی جی کے قتل کے بعد جوشؔ ملیح آبادی نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

تیرے دم سے زمزمہ گنگا کی جولانی میں تھا
نغمہ تجھ سے کوثر و تسنیم کے پانی میں تھا
اے غرورِ ہندو و فخرِ مسلماں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

یادؔ دہلوی کے اشعار بھی قابل توجہ ہیں:

ناز تھا جس پہ مسلماں کو تری ذات تھی وہ
برہمن جس پہ ہوں قربان تری بات تھی وہ
آج کے دور کا ہندو نہ مسلمان تھا تو
صرف انسان تھا انسان تھا انسان تھا تو

گاندھی جی نے ہر طبقات کے لوگوں کے لئے آواز بلند کی۔سرمایہ دارانہ نظام میں ان کی دلچسپی نہیں تھی۔وہ دیسی صنعتوں کے پاسدار تھے اور مقامی صنعتوں کو خود مکتفی بنانا چاہتے تھے۔چرخے اور کھدّر کو انھوں نے اسی بنیاد پر فروغ دیا۔کھیتی ہر کسانوں اور مزدوروں کے حقوق اور فلاح و بہبود کے لئے انھوں نے تحریک چلائی۔یہ محض اتفاق نہیں کہ گاندھی جی نے ہندوستان میں سب سے پہلا جو آندولن چلایا تھا وہ کسانوں کے مسائل و معاملات سے ہی علاقہ رکھتا ہے

گاندھی جی نے ہر طبقات کے لوگوں کے لئے آواز بلند کی۔سرمایہ دارانہ نظام میں ان کی دلچسپی نہیں تھی۔وہ دیسی صنعتوں کے پاسدار تھے اور مقامی صنعتوں کو خود مکتفی بنانا چاہتے تھے۔چرخے اور کھدّر کو انھوں نے اسی بنیاد پر فروغ دیا۔کھیتی ہر کسانوں اور مزدوروں کے حقوق اور فلاح و بہبود کے لئے انھوں نے تحریک چلائی۔یہ محض اتفاق نہیں کہ گاندھی جی نے ہندوستان میں سب سے پہلا جو آندولن چلایا تھا وہ کسانوں کے مسائل و معاملات سے ہی علاقہ رکھتا ہے۔

جسے 'چمپارن ستیہ گرہ' کہا جاتا ہے۔گاندھی جی سے قبل دیگر سیاسی اور سماجی لیڈروں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ کسانوں اور محنت کش طبقوں کی مدد سے انقلاب آزادی کی لَو کو تیز سے تیز تر کیا جاسکتا ہے۔کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کو آزادی کی لڑائی کے دھارے میں شامل کرنے کا کام جس حسن خوبی سے مہاتما گاندھی نے انجام دیا وہ قابل صد احترام اور لائق ستائش ہے۔جگن ناتھ آزادؔ کا یہ شعر توجہ طلب ہے:

جب وطن تھا بے سہاروں، بے کسوں کی سرزمیں
بے سہاروں ،بے کسوں کا آسرا پیدا ہوا

اس ضمن میں کنولؔ ڈبائیوی کا شعر ملاحظہ ہو:

غریبوں کی نحیفوں کی ہمیشہ دستگیری کی
نہ پروا کی مصیبت کی نہ پروا کی اسیری کی

گاندھی جی کی کوششوں کے باعث لوگوں میں کھدّر مقبول ہوا تھا۔کھدر کا استعمال بھی ایک طرح کا خاموش مگر متاثر کن احتجاج تھا۔کیوں کہ اس سے نہ صرف دیسی صنعتوں کا تحفظ ہوا بلکہ اس سے برٹش کمپنیوں میں تیار ہونے والے کپڑوں کے امپورٹ میں کمی واقع ہوئی۔متصدی لال ہندیؔ کہتے ہیں:

مجھے تو ہے اب پسند کھدّر یہ نرم ریشم تمہیں مبارک
مجھے تو کانٹوں میں ہے الجھنا گلاب لے کر میں کیا کروں گا

گاندھی جی ہندوستانی سماج میں موجود چھوا چھوت کا خاتمہ چاہتے تھے۔اچھوتوں کو انھوں نے 'ہریجن' نام دیا۔اسی نام سے وہ ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔گاندھی جی دوسروں کو ہدایت اور تلقین کرنے سے قبل خود اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔اس سے لوگوں کو حوصلہ ملتا تھا اور ایک بڑے حلقے میں ان کی پذیرائی ہوتی تھی۔صدیوں کی محکومی سے شودروں اور اچھوتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔سماج میں ان کو بحیثیت انسان نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک و برتاؤ کیا جاتا تھا۔گاندھی جی نے ان سے ہمدردی جتائی اور ان کی بہتری کے لئے مقدور بھر کدوکاوش کی۔لوگوں کے رویے میں تبدیلی لانے کی غرض سے انھوں نے ملک بھر میں متعدد دورے کئے اور ان پر مختلف مضامین قلم بند کئے۔اس کے لئے انھیں طعن وتشنیع کا شکار بھی ہونا پڑا لیکن ہمیشہ کی طرح ان کے قدم میں ڈگمگاہٹ نہیں آئی۔گاندھی جی کا ہریجن طبقے کے ساتھ جو ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ تھا وہ محض جذباتی نہیں تھا بلکہ منطقی اور استدلالی نوعیت کا تھا۔اس پر انھوں نے بڑا غور وخوض کیا تھا۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک زمانے میں جانوروں کی قربانی کا رواج تھا تو کیا آج ہم پھر اس رواج پر عمل شروع کردیں؟ کیوں کہ ایک وقت میں ہم گائے کا

گوشت کھاتے تھے تو کیا آج پھر کھانا شروع کردیں؟ ایک زمانے میں ہم چوروں کے ہاتھ پیر کاٹ دیا کرتے تھے تو کیا اس ظالمانہ طریقے کو ہم دوبارہ رواج دیں گے؟ کیا ہم اس طریقے کو پھر سے شروع کردیں کہ ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہوں؟ کیا ہم کم سنی کی شادی کو پھر سے رواج دیں گے؟ کیوں کہ ہم نے کسی وقت انسانوں کے ایک طبقے کو گھٹیا اور کمتر قرار دیا تھا تو کیا آج ہم ان کی اولاد کو بھی ذات باہر سمجھیں''۔

(راز، رام آسرا؛ اردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت، دہلی؛ جمال پرنٹنگ پریس، 1977، ص130)

بہادر برقؔ دہلوی کی نظم 'اچھوتوں سے نفرت' گاندھی جی کے افکار و خیالات کا خوب صورت مرقع ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تفریق ہے جو قائم یہ غیر قدرتی ہے
اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
دور از رہِ حقیقت یہ فرق ظاہری ہے
ہر قصر تن میں روشن اک شمع زندگی ہے
جلوے ہیں سب اُسی کے راز حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیص ذات کیا ہے
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا
منھ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا

ان اشعار میں انسان کی عظمت کو بلا کسی تفریق ترجیح دی گئی ہے۔ جو لوگ ورن نظام میں یقین رکھتے ہیں ان پر یہ عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ طبقاتی تقسیم غیر فطری ہے، اسے انسانوں نے اپنے سماجی، سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے قائم کیا ہے۔ رام آسرا راؔز اس نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نظم میں انھوں نے نام نہاد برتری کی بنا پر کٹر ہندوؤں کی علیحدگی پسندی کے رجحانات کی مذمت اور ہری جنوں سے ہمدردی کا اظہار کرکے گاندھی جی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے''۔

(راز، رام آسرا؛ اردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت، دہلی؛ جمال پرنٹنگ پریس، 1977، ص131)

جو زباں سے کہہ دیا بدلا نہ اس کا ایک حرف
اک نہیں شبیرؑ کی قرآں کی آیت ہو گئی

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب' معروف شاعر، معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج و انقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیا دور' بہت جلد نیرؔ سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جا رہا ہے۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

اردو شاعری کے مزاج اور گاندھی جی کے افکار میں حد درجہ یگانگت پائی جاتی ہے۔ سرمایہ داری کی مخالفت، کسانوں مزدوروں کی حمایت، امن و آشتی کی تڑپ، انگریز تسلط سے نجات کی طلب اور سماج کے لئے ایک بہتر مساوات انسانی پر مبنی نظام کی چاہت میں دونوں کے اغراض و مقاصد یکساں نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی کو تشدد سے بیر تھا اور اردو شاعری کے خمیر میں بھی تصوف کی وجہ سے تشدد کے خلاف ردعمل رہا ہے۔ بریں بنا اردو شاعری میں ان کے افکار و نظریات کی بو باس بوقت ضرورت آسانی سے رچ بس گئی اور اس کو اردو شعراء نے مختلف موقعوں پر اپنی شاعری میں ضم کرکے پیش کیا۔ حالانکہ ترقی پسند شعراء کے کلام میں حصول آزادی اور مساواتی معاشی نظام کے لئے سرخ انقلاب کا گن گان گایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تشدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی حیثیت دائمی نہیں محض ہنگامی ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے ملک میں متعدد ایسے مسائل درپیش ہیں جیسے فرقہ واریت، عدم رواداری، تشدد، مذہبی شدت پسندی، ذات پات کی بنیاد پر انسانوں کی توہین، شہری اور دیہی زندگی کے مسئلے، ماحولیاتی آلودگی، قدرتی وسائل و ذخائر کا بے دریغ استعمال اور کسانوں کی زبوں حالی وغیرہ جن کے ازالے کی کوشش گاندھی جی متعلقہ عہد میں کر رہے تھے۔ ان سے پہلے اور بعد کے لوگوں نے بھی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس طرح کی کاوشیں کی ہیں جو بہت حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ پھر بھی آج ان کا ازالہ پوری طرح نہیں ہو پایا ہے۔ کچھ شر پسند عناصر یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو پراگندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور برہمن وادی فکر کے تحت ایک خاص طبقے کے لوگ بے جا جبر و ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اس پر خطر صورت حال میں گاندھی جی کے افکار و خیالات سے معاونت حاصل کی جا سکتی ہے۔ گاندھی جی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرکے اور ان کے افکار و نظریات اور فلسفۂ حیات کو عملی جامہ پہنا کر ملک کو ترقی کی نئی بلندیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے اور یہی ہمارا ان کی شخصیت کے لئے سب سے بڑا خراج ہوگا۔

❑❑❑

محمد ارشد کسانہ
ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی
رابطہ: 7006909305

بیسویں صدی میں گاندھی جی پر لکھی گئی نظمیہ شاعری کی روایت

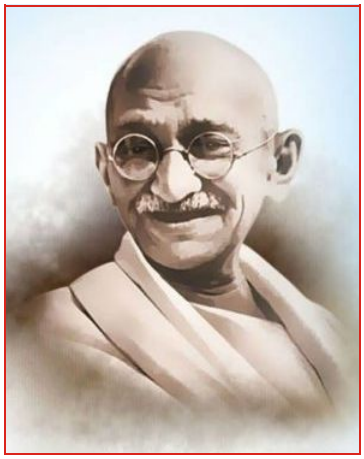

سینکڑوں سالوں کی غلامی سے جھوجھتی ہوئی ہندستانی عوام بے بس اور لاچار ہو چکی تھی۔ لگ بھگ دو سو سال تک انگریزوں نے ہندستان پر راج کیا اور اس بیچ انہوں نے ہندستانی زمین، سماج اور معاشیت کو بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ عوام ظلم برداشت کرتے کرتے کمزور اور ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس سر جھکانے اور دعاؤں کے بغیر کچھ نہ بچا تھا۔ پورے ہندستان کو ایک جھٹ کر کے ان کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا کرنا ایک مشکل کام تھا۔ اس عظیم کام کے لئے خدا نے سرزمینِ ہند پر ایک عظیم شخصیت کو اتارا جو دنیا میں گاندھی جی کے نام سے مشہور ہوا۔ مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی ۲ اکتوبر ۱۹۶۹ کو صوبہ ممبئی کے جزیرہ نما کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے شہر پور بندر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شریمان کرم چند گاندھی تھا جو راجہ پور بندر کے دیوان یا وزیر اعظم تھے۔ ان کی والدہ کا نام پتلی بائی گاندھی تھا اور وہ بہت مذہبی اور نیک خاتون تھیں۔ ہم آج ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں کیونکہ ہمارا ملک ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزاد ہوا تھا۔ مگر یہ آزادی حاصل کرنا کتنا مشکل کام تھا آج کی نسل شائد اس سے واقف نہ ہوگی۔ اس کا اندازہ تبھی لگایا جا سکتا ہے جب ہم ہندوستان کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ جدوجہدِ آزادی سینکڑوں سالوں پر مشتمل ہے۔ لاکھوں لوگوں نے آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ آزادی حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن غلامی قبول کرنا بھی ناممکن تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ تشدد کا راستہ اختیار کر لیتے تھے۔ ۱۹۱۵ کے بعد اس جدوجہد میں گاندھی جی نے حصہ لیا۔ مگر ان کے نظریات باقی لوگوں سے کافی الگ تھے۔ اس وقت اس کارواں کو آگے بڑھانے کے لئے ایسے ہی ایک ذہین آدمی کی ضرورت تھی۔ یہاں آزادی حاصل کرنے کے لئے ملک دو نظریوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک نظریہ تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کی بات کرتا تھا یہ قافلہ بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس کا ترجمان تھا۔ جبکہ دوسرا نظریہ عدم تشدد کی راہ کو منزلِ آزادی کے لئے سب سے اہم سمجھتا تھا۔ اس قافلے کے بانی مہاتما گاندھی تھے۔ مہاتما گاندھی ایک کمزور جسم کے آدمی تھے۔ مگر ان کا ذہن، حوصلہ، جذبہ اور محنت نے وہ کام کر دکھائے جو غلام ہندستانی پچھلے کئی سالوں سے نہ کر پائے تھے۔ ایک ایک کر کے کامیابیاں ان کو ملنے لگیں اور قافلے کے قافلے ان کے پیچھے ہو گئے۔ آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو وہ دن آیا جس کے لئے پورا ہندستان سینکڑوں سالوں سے لڑ رہا تھا۔ یعنی ہندستان آزاد ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے لاکھوں لوگوں نے جان و مال کی قربانیا ں دیں مگر ان سب لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر صحیح منصوبے کے تحت صحیح راستے پر لگانا ایک بڑا کام تھا اور یہ کام جس نے کیا وہ گاندھی جی تھے۔ گاندھی جی نے عدم تشدد اور کئی کارآمد تحریکیں چلائیں جن کے آگے انگریزوں نے اپنا سر جھکا لیا۔ اسی لئے آج ہم گاندھی جی کو راشٹر پیتا کے طور پر جانتے ہیں۔ ایسی عظیم شخصیت کے اثرات ادب پر پڑنا اور ان پر ادب لکھنا ہر ادیب کا فرض ہے۔ اردو ادب میں بھی گاندھی جی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کی تحریکوں اور ان کے کارناموں کے اثرات بھی اردو ادب میں با آسانی مل جاتے ہیں ۔ میرا موضوع گاندھی جی کے اوپر لکھی گئی نظموں کا جائزہ لینا ہے۔ اس لئے میں مذکورہ بالا بحث سے ہٹتے ہوئے اپنے موضوع پر آتا ہوں۔

گاندھی جی کے اوپر اردو میں بہت ساری نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو میں صنف نظم نے کافی دھوم مچا دی تھی۔ اردو میں جتنی بھی شاہکار نظمیں اور بلند پایا نظم نگار ہوئے ہیں وہ بیسویں صدی کے آوائل سے لیکر چھٹی دہائی تک کے مانے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال، فیض احمد فیض، جوشؔ، سرور جہاں آبادی، مجازؔ، میراں جی، ن۔م راشدؔ، علی سردار جعفری وغیرہ اسی عہد کے چمکتے ہوئے ستارے ہیں جن کی روشنی سے آج بھی اردو شاعری درخشاں ہے۔ یہی زمانہ جدوجہدِ آزادی کے عروج اور گاندھی جی کا تھا۔ گاندھی جی اس وقت پورے ہندستان کے لئے آزادی کی واحد امید تھی۔ اس لئے اردو نظم گو شعرا کا ان سے متاثر ہو کر نظمیں تخلیق کرنا فطری تھا۔

ان پر لکھی گئی نظموں میں سے سب سے پہلا نام ''گاندھی نامہ'' کا آتا ہے۔ اس کے خالق اکبرالہ آبادی ہیں۔ یہ نظم ۱۹۱۹ سے لیکر ۱۹۲۱ کے درمیان لکھی گئی۔ اور ۱۹۲۱ کو ہی اکبرالہ آبادی کی وفات ہوجاتی ہے۔ اس لئے یہ ان کی زندگی میں چھپ نہ سکی۔ اس نظم کو ۱۹۴۸ میں پروفیسر محمد نعیم الرحمن نے مرتب کر کے الہ آباد سے ایک مجموعے کی شکل میں شائع کیا۔ کل مجموعے میں ۱۹۸ قطعے ہیں جو سات عنوانوں کے تحت ۱۳۷۲ اشعار پر مشتمل ہیں۔ اکبرالہ آبادی وطن پرستی کے جذبے سے لبریز تھے۔ انھوں نے ساری عمر اصلاحی شاعری کی۔ ان کی نظر میں سماج، قوم اور وطن بہت اہمیت رکھتے تھے اس لئے ہمیشہ سے ہی چاہتے تھے برایاں ختم ہوں اور ترقی کے لئے راہ ہموار ہو۔ آزادی حاصل کرنے کا رجحان اس وقت زوروں پر تھا۔ گاندھی جی کی جدوجہد کا چرچا عام تھا اور وہ گاندھی جی سے بہت متاثر ہوئے۔ گاندھی جی میں ان کو آزادی کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب دورِ گاندھی نامہ ہے

اس نظم کے ذریعے وہ عام لوگوں کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو گاندھی جی کے اختیار کیے ہوئے راستے پر چلنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس وقت گاندھی جی کے اوپر بہت لوگ طنز کر رہے تھے۔ اور اختلاف لوگوں میں عام ہو رہا تھا۔ اکبرالہ آبادی نے انہیں اختلافات اور برایوں کو ختم کرنے کے لئے گاندھی نامہ لکھا۔ اس طویل نظم کو انہوں نے سات حصوں میں تقسیم کیا۔ ''گاندھی نامہ'' کی تمہید میں نعیم الرحمن نے ان سات عنوانوں کو یوں لکھا ہے:

''اعتراضات، ہندوؤں کے ساتھ ہوگئے، گاندھی کا ساتھ بغاوت نہیں ہے، ترک مولات کی توجیہہ، عدمِ ترکِ مولات کی توجیہہ، بے پروائی و بے تعلقی اور ظرافت''

اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

جو پوچھا کیوں کمر اس منزلِ تاریک میں باندھی
زبانِ حضرت شوکت سے بولے با اثر گاندھی
مسلم کا میاں پن سوخت کرو ہندو کی بھی ٹھکرائی نہ رہے
بن جاؤ ہر ایک کے باپ یہاں دعوے کو کوئی بھائی نہیں
گاندھی کے ساتھیوں میں جو ہیں وہ نیک ہی ہیں
''مہراج'' اور ''مہاجر'' کے حرف ایک ہی ہیں

آفتاب رائیس پانی پتی جن کا پورا نام لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی تھا۔ یہ ملکی اور ملی شخصیت، واقعات اور تہواروں پر اپنی نظموں کے لئے معروف ہیں۔ حب الوطنی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ''آفتاب وطن'' کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ ۱۹۳۱ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد وطن سے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی مجموعے میں انہوں نے گاندھی جی پر دو نظمیں لکھی ہیں۔ ''بابا گاندھی'' اور ''نوید آمد مہاتما گاندھی'' یہ دونوں نظمیں گاندھی جی کی جدوجہد اور ان کی تحریکوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی نظم ''بابا گاندھی'' سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

سوراج کا جھنڈا بھارت میں گڑوا دیا گاندھی بابا نے
دل قوم و وطن کے دشمن کا دہلا دیا گاندھی بابا نے
الفت کی راہ میں مرجانا، پر نام جہاں میں کر جانا
یہ پاٹھ وطن کے بچوں کو سکھلا دیا گاندھی بابا نے
(نظم ''گاندھی بابا'')

آنند نرائن ملا الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور لوک سبھا کے رکن بھی رہے ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے ممتاز ترین شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اردو زبان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'' اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں اپنی مادری زبان نہیں''
(آنند نرائن ملا شاعر اور دانشور، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)

آنند نرائن ملا نے لگ بھگ ۱۹۱۷ میں شاعری شروع کی۔ اور یہ دور جدوجہد آزادی کا دور تھا۔ چاروں طرف آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔ حب الوطنی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی شہرت

اس وقت ہر گھر میں تھی ۔ ان حالات سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار ادب میں کرنا فطری تھا۔ وہ بھی ذہنی طور پر اس قافلے کے پیچھے ہو گئے۔ اس قافلے کو راہ دکھانے والے گاندھی جی تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب قافلہ اپنی منزل کو پہنچ گیا۔ آزادی ملنے کے ایک سال بعد گاندھی جی کا قتل ہو جاتا ہے۔ یہ صدمہ دیش کے ہر انسان کے لئے ایک نا قابل برداشت حادثہ تھا۔ آنند نرائن ملا نے اس حادثے پر ایک نظم لکھی ''مہاتما گاندھی کا قتل'' اور اپنے درد کو عیاں کیا۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''جوئے شیر'' میں شامل ہے جو ۱۹۴۹ کو منظر عام پر آیا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مشرق کا دیا گل ہوتا ہے، مغرب سیاہی چھاتی ہے
ہر دل سن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لو تھراتی ہے
اتر دکھن، پورب پچھّم، ہر سمت اک چیخ آتی ہے
نوع انسان شانوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

نظم، مہاتما گاندھی کا قتل، جوئے شیر''

گاندھی جی کا قتل پورے ملک کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس حادثے پر اور بھی بہت ساری نظمیں لکھی گئی۔ روش صدیقی کی نظم ''مسافر ابدی'' اس موضوع پر ایک اہم نظم ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مسافر ابدی کی نہیں کوئی منزل
یہاں قیام کیا یا وہاں قیام کیا
تری وفا نے بڑا مرحلہ کیا آساں
فروغِ صبح سے روشن چراغ شام کیا

اسی حادثے پر اسرار الحق مجازؔ نے ۱۹۵۰ میں ''سانحہ'' نام سے ایک نظم لکھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درد و غم ِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ حضر ِ عصر و عیسیٰ دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا ، نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

اظہارؔ ملیح آبادی جوشؔ کے حقیقی بھانجے تھے۔ گاندھی جیجب اس دنیا سے چلے گئے تو پورا ماحول ہی بگڑ گیا ۔ پہلے جب بھی کوئی مسلہ پیدا ہوتا تھا تو لوگ گاندھی کو یاد کرتے تھے کہ باپو ہیں تو مسلہ بھی حل ہو جائے گا مگر اب ان کی موت کے بعد سماں ہی بدل گیا۔ حالات کافی حد تک بگڑ گئے ۔ برایاں، خرابیاں اور قتل و غارت عام ہو گئے ۔ اظہارؔ نے اس پس منظر میں اپنی نظم ''گاندھی کے بعد'' تخلیق کی ۔ جو ان کے شعری مجموعے ''نئے ترانے'' میں شامل ہے ۔ یہ نظم ۱۹۵۳ میں لکھی گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

بعد گاندھی کے نہ سن ہم نے سماں دیکھا کیا
فصلِ گل آتے ہی ہر باغ و چمن اجڑا کیا
دل ہی افسردہ ہو جب پیش کش صہبا کیا
آنکھ ہی جب نہ رہے دعوت نظارہ کیا

مجاہد آزادی اقبال احمد سہیلؔ وطنی شاعری کے حوالے سے کافی اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے ''گاندھی'' کے نام سے ایک اہم نظم لکھی جو کافی مشہور ہوئی ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

وہ حدیث روح پیام جاں جسے ہم نے سنکے بھلا دیا
وہ حریم غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا
وہ ملک وملت جاں بلب جسے اس نے آب بقا دیا
اسی ناسپاس نے ہائے اب اسے جام مرگ پلا دیا

۱۹۵۸ میں جگر مرادآبادی کا شعری مجموعہ ''آتش گل'' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں گاندھی جی پر لکھی ہوئی ایک نظم تھی ''گاندھی جی کی یاد میں'' یہ بہت مشہور ہوئی۔ اس نظم سے جگر مرادآبادی کی گاندھی جی سے بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نظم کو شخصی مرثیہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہی مہاتما وہی شہید امن و آشتی
پریم جس کی زندگی ،خلوص جس کا پیرہن
وہی ستارے ہیں ،مگر کہاں وہ ماہتاب ہند
وہی ہے انجمن ،مگر کہاں وہ صدر انجمن

نازش پرتاپ گڑھی ترقی پسند تحریک کے اہم شاعر تھے۔ وہ زندگی بھر عملی اور تخلیقی دونوں سطح پر تحریک کے نظریات کو عام کرنے اور ایک شاندار معاشرے کے قیام کی کوشش میں لگے رہے ۔ انہوں نے بڑی تعداد میں ایسی نظمیں لکھیں ہیں جو وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبات سے مملو ہیں۔ ۱۹۶۴ میں انہوں نے ''گاندھی جی کی آواز'' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں انہوں نے ملک میں بڑھتی برایوں کے متعلق اپنی فکر کا اظہار اور گاندھی جی کی قربانیوں کو بھلانے کے سانحہ کو پیش کیا ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

سلام اے افق ہند کے حسیں تارو
سلام تم پہ سپہر وطن کے مہ پارو
سلام تم پہ مرے بچو اے مرے پیارو
بھلائے بیٹھے ہو تم مجھ کو کس لئے یارو

عرش ملسیانی اردو کے مشہور شاعر جوش ملسیانی کے صاحبزادے تھے۔ وطن سے محبت ان کی رگ رگ میں تھی۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ حب الوطنی سے لبریز ہے۔ مہاتما گاندھی سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ انہوں نے بہت سی نظمیں گاندھی جی پر لکھی۔ جن کو بعد میں جمع کر کے ''گاندھی گان'' کے نام سے مجموعے کی صورت میں گاندھی جی کی ولادت کے جشن صد سالہ پر شائع کیا۔ وہ اس مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

''گاندھی امن کا پیام بر تھا۔ اس نے سوئی ہوئی جنتا کو جگایا ۔ اس کی سیاست فریب اور مکر پر مبنی نہیں تھی۔ وہ ہر بات میں راستی کو پیش لفظ رکھتا تھا۔ اس کی ولادت کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں ''گاندھی گان'' ایک حقیر خراج عقیدت ہے۔''

''گاندھی گان، عرش ملسیانی''

ان کی نظم ''پیغمبر امن'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صد سالہ تیرا جشن ِ ولادت منائیں ہم
نغمہ الوہیت کا جہاں کو سنائیں ہم
اہلِ وطن کے دل میں عداوت کا شور ہے

اہل وطن کو درسِ اخوت پڑھائیں ہم

ساحرؔ لدھیانوی اردو کے بڑے نظم نگار ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۹ میں گاندھی شتابدی اور غالب صدی کے موقعے پر ''گاندھی ہو یا غالبؔ ہو'' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ انہوں نے اس نظم کے ذریعے سال کے بدترین فرقہ وارانہ فساد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ ایک بغاوتی نظم ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

گاندھی ہو یا غالبؔ ہو
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ انہیں اب کر دیں دفن
ختم کرو تہذیب کی بات

عادل جعفری نے ''ذکرِ گاندھی'' کے نام سے ایک نظم ۱۹۶۹ میں لکھی۔ اس کا موضوع گاندھی جی کی حیات وخدمات کو یاد دلانا ہے۔ وطن کے لئے ان کی قربانی کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک آدھ سال سے ہے فضا ملک کی کچھ اور
غالب صدی کے بعد ہے گاندھی صدی کا دور
گاندھی کو کون ایسا ہے جو جانتا نہ ہو
عزت کے ساتھ ان کو بڑا مانتا نہ ہو

حرمت الاکرام جدید اردو شاعری کے ایک اہم رکن مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۰ کے بعد شاعری شروع کی۔ اور بہت جلد اردو شاعری میں اپنا لوہا منوالیا۔ ان کی شاعری حقیقت اور سیاست دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ ان کا تعلق کلکتہ سے تھا اور وہاں کی آب وہوا ان کی شاعری کی جان ہے۔ قومی شاعری ان کے ہاں اتنی نہیں ملتی مگر پھر بھی جو ہے وہ کمال ہے۔ ''گاندھی'' کے نام سے انہوں ایک نظم کہی جس کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''جلوہ نمو'' میں شامل ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

آغوش میں پھولوں کی تھرکتا ہوا شعلہ
انگاروں کے گہوارے میں سوئی ہوئی شبنم
اک جذبہ اک احساس اک انداز اک آواز
نکھرا ہوا اک درد تپایا ہوا اک غم

بچوں کے شاعر کیف احمد صدیقی کا شعری مجموعہ ''سدا بہار نظمیں'' ۱۹۸۰ کو شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی بچوں کے لئے ہی ہے مگر ان کا موضوع زیادہ تر دینی اور حب الوطنی تھا۔ اور حب الوطنی کے تحت ہی انہوں نے غالب پر دو نظمیں ''باپو'' اور ''وہ گاندھی'' لکھیں۔ ان نظموں سے انہوں نے گاندھی جی کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ جن کو پڑھ کر بچوں کے اندر حب الوطنی کا ایک جذبہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ''وہ گاندھی'' سے دو اشعار پیش ہیں:

وہ گاندھی امن کی دیوی کا جو سچا پجاری تھا
جفا و ظلم کا دشمن اہنسا کا پجاری تھا
وہ گاندھی جس کے ہاتھوں سے ملی تھی ہم کو آزادی
وہ جس نے اپنے خوں سے ہند کی تقدیر چمکادی تھی

سیدہ فرحت بیسویں صدی کی شاعری میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے چھپے ہیں۔ شاعری کے لئے ان کے پاس کوئی ایک موضوع نہیں تھا بلکہ ان انہوں نے ہر ایک موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''بچوں کی مسکان'' خالص بچوں کے لئے ہے جو ۱۹۸۱ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں وطن کے لئے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے میں ''گاندھی جی'' کے نام سے ایک نظم ہے۔ اس نظم کا موضوع گاندھی جی کے نظرئے کو عیاں کرنا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

سچی بات ہمیشہ کہنا
سچائی کے رستے چلنا
باپو نے سمجھایا
باپو نے سمجھایا

ابرار کرت پوری نعتیہ شاعری کے لئے جانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مجموعہ ''دلکش نظمیں'' پورا کا پورا وطنی شاعری سے لبریز ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۷ کو منظر عام پر آیا۔ ان کی نظم ''گاندھی جی'' اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

راہ بر دیش بھگتی کا وہ
شاہ تھا ایک لنگوٹی کا وہ
پیار کے وہ لٹاتا تھا پھول
تھا اہنسا اسی کا اصول

ساحرؔ ہوشیار پوری سے کون واقف نہیں ہے۔ جدید شاعری میں ان کا مقام کافی بلند ہے۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے چھپے ہیں۔ ۱۹۹۰ کو ان کی شاعری کا مجموعہ ''سحر خیال'' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ''گاندھی ایک فقیر'' کے نام سے نظم شامل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے گاندھی جی کے کارناموں کو یاد دلانے کی سعی کی ہے۔ یہ نظم کافی دلچسپ ہے جو گاندھیان نظم کی روائت کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

یہ فسوں کاری ہوئی جس کے سبب وہ کون تھا
یہ جنوں کاری ہوئی جس کے سبب وہ کون تھا
نام تھا گاندھی، مگر اس کے ہزاروں نام ہیں
ایک مے خانہ ہے جس میں ہر طرح کے جام ہیں

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ اور بھی بہت ساری نظمیں گاندھی جی کو موضوع بناتی ہوئی ہمیں با آسانی مل جاتی ہیں۔ گاندھی جی کی شخصیت کوئی عام نہیں کہ اب ان پر نظمیں لکھنے کا یہ سلسلہ تھم جائے گا بلکہ آنے والے وقت میں ان پر اور بھی بہت ساری نظمیں دیکھنے کو ملیں گی۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ میں نے بیسویں صدی کی نظمیہ شاعری کا سرسری طور پر جائزہ لیا ہے اور امید سے بڑھ کر گاندھی پر لکھی گئی نظمیں ملی ہیں۔ ان تمام نظموں کو تاریخی عتبار سے یکجا کر کے ان کا موضوعاتی مطالعہ کیا۔ اس طرح بیسویں صدی میں گاندھی جی کے اوپر لکھی گئی نظموں کی ایک روایت سامنے آتی ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر ریحان حسن
شعبۂ اردو و فارسی، گرونانک یونیورسٹی، امرتسر (پنجاب)
رابطہ: 8559020015

اردو شاعری میں گورونانک جی کی عظمت

(۵۵۰/ پرب کے موقع پر)

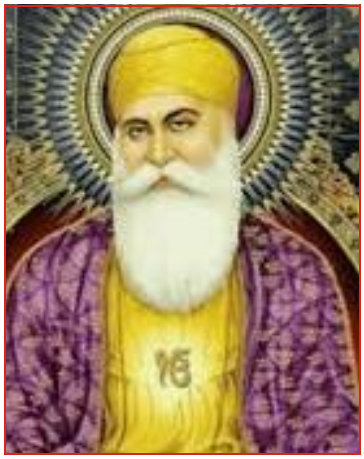

اردو زبان ہماری مشترکہ قومی تہذیب کا ثمرہ ہے اسی لئے اردو کے ادباء اور شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اس تہذیب کے ارتقاء اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ صداقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان مختلف قوموں کے دلوں کو جوڑنے کا ہی فریضہ انجام دیتی ہے لیکن اردو زبان نے ہماری گنگا جمنی تہذیب و ثقافت اور احترام آدمیت کا جس قدر خیال رکھا ہے وہ دیگر زبانوں میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو زبان میں اگر عید، شب برات اور محرم سے متعلق بیشمار نظمیں ملتی ہیں تو ہولی دیوالی اور دسہرہ سے متعلق نظموں سے بھی اردو کا دامن خالی نہیں۔ اردو زبان میں اگر انبیاء، اولیاء، صوفیاء اور ائمہ کرام کی شان میں عقیدت کے پھول نثار کئے گئے ہیں تو رام چندر جی، کرشن جی اور گورونانک جی کی عظمت کے گن گان سے بھی اردو زبان کا دامن پر ہے۔

اردو زبان ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کے درمیان رابطہ کی زبان تھی لہذا اس زبان نے تمام مذاہب کے احترام کا سب سے زیادہ سبق بھی سکھایا۔ اردو زبان کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان کے شعراء اور مصنفین نے ایک دوسرے کے مذاہب کے متعلق نظم و نثر میں جس انداز سے نقوش ثبت کئے ہیں اس کی مثال شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ اگر اس زبان میں حضرت محمد مصطفے، حضرت علی اور صحابۂ کرام وغیرہ کے متعلق نعتیں و منقبتیں ملتی ہیں تو رام کرشن جی، رام چندر جی اور گورونانک دیو جی کے لئے نظمیں بھی نظر آتی ہیں جن میں عقیدت کے بیش بہا پھول نثار کئے گئے ہیں۔ بالخصوص ہندوستانی زبانوں میں پنجابی زبان کے دوش بدوش اردو زبان میں ابتدا ہی سے گورونانک جی کی شان میں جو قصیدے ملتے ہیں جو انتہائی جذب و کشش کے حامل ہیں کیوں کہ گورو جی کی تعلیمات میں آج کے انسان کے لئے بھی راہ ہدایت پوشیدہ ہے اور محبت ایک ایسی نعمت ہے جس کے ذریعے انسانوں کے دلوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ گورونانک دیو جی کی تعلیمات کی بنیاد محبت پر ہی مبنی ہے جس کی بدولت بقول آر۔ ڈی سیال وفا پٹیالوی:

غریبوں بے نواؤں کا سہارا ہے گورو نانک
جہاں معرفت کا اک ستارہ ہے گورو نانک
مذاہب کے جھمیلے ختم کر ڈالے محبت نے
محبت کا ہی اک روشن ستارا ہے گورو نانک

تمام مذاہب کے رہنماؤں نے انسانوں کی بھلائی ہی کے لئے کام کیا۔ ان کے اقوال و اعمال انسانوں کو نیک سچے اور سیدھے راستے کی ہی رہنمائی کرتے ہیں گورو نانک دیو جی نے بھی اپنے اقوال و اعمال اور افعال کے ذریعے انسانوں کو سیدھے اور سچے راستے پر چلنے کی تلقین کی بسمل سعیدی دہلوی کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے:

کیا درس ہے وہ درس جو اقوال میں ہے
حکمت سی وہ حکمت ہے جو اعمال میں ہے
وہ قول ہو تیرا کہ عمل ہو، نانک
بے مثل وہ اس عالم امثال میں ہے

بسمل سوہاتوی کو واقعہ نگاری میں ید طولی حاصل ہے انھوں نے ''ایک سوداگر'' کے عنوان سے نظم میں گورو نانک جی کو سراپا نور، پیکر ایثار، کارواں سالار، سچا رہنما اور نازش ہندوستان قرار دے کر ایسی تصویر پیش کی ہے کہ گورو جی کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ہے:

ایک سوداگر متاع حق لئے گفتار میں
سچا سودا کرنے آیا دہر کے بازار میں
وہ سراپا نور حق تھا جس کا نانک نام تھا
معرفت کے میکدہ کا اک چھلکتا جام تھا
ہر تن عریاں پہ لطف وفیض کی پوشاک تھی
خار کا غم کھانے والا گل گریباں چاک تھا
اس کی بانی ،وید بھی قرآن بھی انجیل بھی
اس کی بانی شمس بھی مہتاب بھی قندیل بھی

گورو نانک جی کی تعلیمات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بانیاں اور تعلیمات دنیا میں ہر جگہ بسنے والے انسانوں کے لئے مفید ہیں۔ ان کی خدمات اور تعلیمات کو دیکھ کر بسمل سوہاتوی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ:

باغبان گلشن ہندوستاں کہئے اسے
پاسبان رنگ و بوئے بوستاں کہئے اسے
رازدار بانئ کون ومکاں کہئے اسے
جملہ موجودات کی روح رواں کہئے اسے
شان قومی نازش ہندوستاں کہئے اسے
طرۂ توقیر و ناموس جہاں کہئے اسے

صداقت تو یہ ہے کہ بابا نانک کی عظمت و منزلت کا سبھی نے اعتراف کیا ہے ان کی شخصیت اور ان کی تعلیمات ہر شخص کے لئے جاذب ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں میں گورو نانک جی کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اردو زبان میں جس انداز سے بابا نانک کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ بے مثال ہے۔

یقیناً گورو جی کے ہر عمل اور قول سے توحید حق کا نغمہ پھوٹتا ہے۔ انھوں نے معرفت پروردگار کا جو سبق دنیا والوں کو پڑھایا وہ انسانوں کے لئے خدا کی معرفت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ انسانوں کے لئے بے انتہا نفع بخش بھی ہے۔ اردو زبان کے سرمایہ شاعری میں گورو نانک جی کی شان والا صفات میں برق دہلوی کی جو نظم ملتی ہے اس میں انھوں نے گورو نانک جی کی شخصیت کا گن گان کچھ اس طرح کیا ہے:

دل ترا آگاہ تھا توحید کے اسرار سے
قلبِ روشن تھا منور جلوہ اسرار سے
معنی وحدت کھلے تیرے لب اظہار سے
تھی نوائے راز پیدا ہر نفس کے تار سے
معجزہ دکھلا گئی تاثیر گویائی تری
نقش خاطر ہو گئی تعلیم یکتائی تری
تیرا در تھا فیض کا چشمہ برائے خاص و عام
ہو گئے پنجاب میں سیراب لاکھوں تشنہ کام

برق دہلوی کی یہ نظم گورو نانک جی کے خصائص سے ہمیں بخوبی واقف کراتی ہے۔ انھوں نے گورو جی کی زندگی کے مختلف واقعات کو خوبصورت انداز میں نظم کر کے عقیدت کی شاعری میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ گورو نانک جی کے کردار، افعال و اعمال اور اقوال آج ہر انسان کے لئے توجہ کا مرکز ہیں۔ ان میں جس قدر خوبیاں اور اچھائیاں تھیں اس کا بیان کرنا شعراء، خطباء اور نثر نگاروں کے حیطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔

گورو نانک جی کے دل میں انسانیت کے لئے جو درد تھا اس کی جانب شاعر نے خوبصورت انداز میں اشارے کئے ہیں اور یہ باور کرایا ہے کہ انھوں نے اپنے قول و عمل کے ذریعے مذہب کی اصل سچائی سے لوگوں کو متعارف کرایا اور یہ ثابت کیا کہ مذہب تفریق و جدائی کا خواہاں نہیں بلکہ اتحاد و یگانگت کا طلبگار ہے۔ خدا کے نزدیک نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، نہ کوئی بدھ مت ہے نہ کوئی عیسائی بلکہ دنیا کے تمام انسان خدائے واحد کے بندے ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں انسانیت کی قدروں اور انسانیت کے اے اصول کی پاسداری ہی میں مذہب کی سچائی مضمر ہے۔ بقول جاوید وششٹ:

اس نے جھوٹے بتوں کو توڑا تھا
اس نے ٹوٹے دلوں کو جوڑا تھا
چاک داماں بھی سی دیا سب کا
سب کے زخموں پہ رکھ دیا پھایا

آج بھی گوردوارے کے دروازے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لئے کھلا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ گورو نانک جی نے مذہب کی تفریق ختم کرنے کے لئے محض قول کا سہارا ہی نہیں لیا بلکہ عملی ثبوت بھی پیش کیا۔ :

یہ سنہری کلس ، یہ گرودوارے
سب ہیں انسانیت کے گہوارے
ان میں گونجے ہے وہ مدھر بانی
جس طرح جل ترنگ میں پانی
درس توحید کا دیا سب کو
مل گیا جیسے اک دیا سب کو

گورو نانک جی نے معاشرہ سے برائیوں کوختم کرنے کی سعی کرتے ہوئے نیکیوں کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ ہرطرح کی تفریق کوختم کرنے کے سلسلے میں جو کوشش کی اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جگر جالندھری کا یہ کہنا درست ہے:

''سب برابر ہیں'' یہ دنیا کو سکھایا تو نے
جذبہ تفریق کا ہر دل سے مٹایا تو نے
سینۂ دہر میں الفت کے شرارے بھر کر
خرمنِ نفرت و کینہ کو جلایا تونے

گورو نانک جی نے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ خدا کی ذات ہی لائق عبادت ہے اور وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، یہ تعلیم ایسی تھی کہ جس سے خدا کا انکار کرنے والے اور خدا کو بتوں کی شکل میں پوجا کرنے والوں کے مفروضی خیالات کی تردید ہوئی بقول رتن پنڈوری:

تو نے روشن سب پہ اسرار حقیقت کر دیئے
اہل کثرت آشنائے راز وحدت کر دیئے
تیری تلقین و نصیحت کام اپنا کر گئی
سینکڑوں گمراہ شیدائے طریقت کر دیئے
تیرے مسلک نے ملا دیں دیر و کعبہ کی حدیں
جوش زن ہر دل میں جذبات عقیدت کر دیئے
قصر ایمان کی بنا ڈالی تری تعلیم نے
منہدم ایوان کفر و شرک و بدعت کر دیئے

گورو نانک جی نے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ خدا کی ذات ہی لائق عبادت ہے اور وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ان کی یہ تعلیم ایسی تھی کہ جس سے خدا کا انکار کرنے والے اور خدا کو بتوں کی شکل میں پوجا کرنے والوں کے مفروضی خیالات کی تردید ہوئی بقول رتن پنڈوری:

تو نے روشن سب پہ اسرار حقیقت کر دیئے
اہل کثرت آشنائے راز وحدت کر دیئے
تیری تلقین و نصیحت کام اپنا کر گئی
سینکڑوں گمراہ شیدائے طریقت کر دیئے
تیرے مسلک نے ملا دیں دیر و کعبہ کی حدیں
جوش زن ہر دل میں جذبات عقیدت کر دیئے
قصر ایمان کی بنا ڈالی تری تعلیم نے
منہدم ایوان کفر و شرک و بدعت کر دیئے

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمام مذاہب کے رہبروں نے اس دنیا کے انسانوں کو صحیح اور سچے راستے کی رہنمائی کی ہے اگر ان کے بتائے ہوئے راستے پر انسان عمل پیرا ہوجائے تو اس کی زندگی خوشی و شادمانی سے پر ہوسکتی ہے۔رگھبیر داس ساحر (سیالکوٹی) جالندھری کا گورو نانک جی کے متعلق یہ کہنا:

تو نے ہر انسان کو انسان کا رتبہ دیا
تیری نظروں میں تھی یکساں وقعت شاہ وگدا
ختم تو نے کر دیا چھوٹے بڑے کا امتیاز
ایک صف میں سامنے تیرے تھے محمود ایاز

ساحر نے اس نظم میں لالو اور بھاگو کی دعوت کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

راستی مذہب تھا تیرا آشتی پیغام تھا
ہر گھڑی ہر وقت تیرے لب پر ہر کا نام تھا
نیک بندوں کی محبت میں وہ تیرے معجزے
دودھ پیدا کر دیا لالو کی نان خشک سے
اس لئے بھاگو کی دعوت میں ہوا شامل نہ تو
اس کے حلوے میں عیاں دیکھا غریبوں کا لہو

رگھبیر داس ساحر کے یہ اشعار اسلامی تعلیمات سے گہری وابستگی کا مظہر ہیں اس لئے کہ جب انسان نماز میں خدا کی عبادت کے لئے اس کے حضور کھڑا ہوتا ہے تو وہاں امیر و فقیر ادنی و اعلی آقا و غلام میں کوئی امتیاز برقرار نہیں رہتا اگر انسان اسی تربیت کو عملی زندگی میں پیش کرنے لگے تو نہ جانے کتنے اختلاف و افتراق کی دیواریں خود بخود مسمار ہوجائیں گی اور یہی رنگ و نسل کی تفریق مٹانے کی عملی تربیت انسانوں کی گورو نانک دیو جی نے کی جس کے لئے انسانیت ان کی احسانمند ہے۔

گورو نانک جی اس خاکدان عالم پر جس عہد میں آئے گھٹا ٹوپ تاریکی پھیلی ہوئی تھی، مذہب کی صورت تبدیل ہوچکی تھی اور کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کہ انسانوں کو اس گمراہی سے کیسے بچایا جائے۔ایسے ماحول میں گورو نانک جی نے انسانوں کو سچائی کا راستہ دکھایا۔اس ماحول کی منظر کشی رشی پٹیالوی نے کچھ یوں کی ہے:

بادہ غفلت سے روح قومیت سرشار تھی
ہستیٔ مذہب زمانے میں ذلیل وخوار تھی
فطرت کفر آشنا مجبور تھی لاچار تھی
روح یزداں اہریمن سے برسر پیکار تھی
شمع حق پر مٹنے والا کوئی پروانہ نہ تھا
بندۂ مہرو مروت کا پتہ ملتا نہ تھا

اردو کے بے مثل ادیب، صحافی اور لاجواب شاعر بخشی شوری لال اختر امرتسری کی گورو نانک جی کی شان میں جو رباعیاں ملتی ہیں ان میں انھوں نے گورو جی سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اختر امرتسری کی رباعیات روانی اور مضمون آفرینی کی بناء پر بیحد دل آویز ہیں۔ انھوں نے عقیدت میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں ان کا کہنا ہے:

آئینہ اسرار زماں تھے نانک
دائندہ ہر رمز نہاں تھے نانک
وہ راہ عبادت میں تھے ممتاز جہاں
اس فقر میں بھی شاہ جہاں تھے نانک

گورو نانک جی کے عہد میں ہر طرف منافقت کا دور دورہ تھا شیخ و برہمن آپس میں دست و گریباں تھے ایسے ماحول میں انھوں نے پیغام محبت کو صرف پھیلایا ہی نہیں بلکہ بچھڑے ہوئے دلوں کو ملایا بھی ،اس عہد کی عکاسی صابر ابوہری کی زبانی سنئے:

جہالت میں ہر شخص ڈوبا ہوا تھا
حقیقت سے نا آشنا تھا زمانہ
کوئی چاند سورج کو دیتا تھا پانی

کوئی کفر وایماں کے چکر میں گم تھا
سمجھتا تھا کوئی خدا ہے بتوں میں
مکیں اس کو کعبے کا کہتا تھا کوئی
کوئی جان دیتا تھا دولت کی خاطر
کوئی چور تھا جام مئے کے نشے میں
نفاق و عداوت کا تھا دور دورہ
جھگڑتے تھے آپس میں شیخ و برہمن
محبت کا دنیا سے نام اٹھ گیا تھا
کدورت کا چھایا تھا ہر سو اندھیرا

گورو نانک جی نے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ مرتے وقت انسان کے ساتھ دولت نہیں جاتی ہے۔ اس لئے دنیا میں ایمانداری کے ساتھ زندگی بسر کرو انھوں نے اس کا عملی ثبوت بھی اس وقت پیش کیا کہ جب ایمن آباد شہر کے امیر ترین آدمی نے گورو نانک جی کی وقعت وعزت اور شہرت کو دیکھ کر انھیں دعوت پر اپنے یہاں مدعو کیا لیکن گورو جی علاقہ کے غریب لکڑی کے کاریگر بھائی لالو کی عقیدت کو دیکھ کر اس کے یہاں گئے۔ گورو جی کے اس عمل سے ملک بھاگو کو پشیمانی محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا گورو جی کو راضی کیا کہ وہ ان کے یہاں دعوت میں شریک ہوں۔ جب وہ راضی ہو گئے تو اس نے علاقہ میں شہرہ کر دیا کہ گورو جی ملک بھاگو کے یہاں دعوت میں آ رہے ہیں چنا۔ نچہ مجمع اکٹھا ہو گیا۔ گورو نانک جی نے موقع غنیمت جان کر بھائی لالو کے یہاں کا کھانا بھی ملک بھاگو کے یہاں منگوالیا۔ کہا جاتا ہے کہ گورو نانک جی نے ایک ہاتھ میں ملک بھاگو کے یہاں کی روٹی کو پکڑا تو دوسرے ہاتھ میں بھائی لالو کے یہاں کی روٹی لی جب دونوں روٹیوں کو دبایا تو ملک بھاگو کے یہاں کی روٹی سے خون گرا اور بھائی لالو کی روٹی سے دودھ گرنے لگا۔

گورو نانک جی کے اس عمل کا مطلب یہ تھا کہ ملک بھاگو کی روٹیوں میں انسانوں کا خون ہے۔ اور بھائی لالو کی روٹیوں میں محنت ومزدوری اور سچائی کا شیر ہے۔ اس پورے واقعے کو جناب مترنکودری نے کچھ یوں نظم کیا ہے:

کہیں رہتا تھا اک ترکھان لالو نام تھا جس کا
گھروں میں جا کے محنت اور مزدوری وہ کرتا تھا
غریبوں کی کوئی عزت نہ کچھ توقیر ہوتی ہے
طبیعت کی شرافت باعث تشہیر ہوتی ہے
نہایت تنگ دستی میں گزر اوقات کرتا تھا
جو روکھی سوکھی ملتی تھی اسی سے پیٹ بھرتا تھا
مگر با ایں ہمہ اس پر خدا کی خاص رحمت تھی
خلوص وصدق واستغنا کی اسکے پاس دولت تھی
گرفتار الم ہو کر بھی وہ آزاد رہتا تھا
قناعت کا یہ عالم تھا کہ ہر دم شاد رہتا تھا
ہمیشہ صابرو شاکر بھی تھا،مست رضا بھی تھا
وہ دنیا دار بھی تھا اور دنیا سے جدا بھی تھا

مترنکودری نے گورو نانک جی کے دعوت طعام کے واقعہ کو نظم کر کے واقعہ نگاری کی جو مثال پیش کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ترکھان لالو اور ملک بھاگو کے دعوت کا ذکر کس قدر خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

گورو نانک اچانک ایک دن اسکے ہوئے مہماں
ہوا لالو بہت اس خوبی تقدیر پر نازاں
کسی کے گھر میں آجائے جو خود چل کر حبیب اسکا
ستارے کی طرح چمکے نہ کیوں کر پھر نصیب اس کا
شراب معرفت کا دور صبح و شام چلتا تھا
زیارت کو جو آیا قالب عرفاں میں ڈھلتا تھا
رہا کرتی تھیں ہر دم،ہر گھڑی عرفان کی باتیں
تصوف،خود شناسی،حق شناسی،گیان کی باتیں
گورو کے جو عقیدت مند تھے وہ روز آتے تھے
اسی روحانیت کے چشمے سے وہ فیض پاتے تھے
گل روحانیت کی بو کا چرچا دور تک پھیلا
پیام مرشد کامل کا شہرہ دور تک پھیلا
مگر اس بات پر کچھ حاسد کم مایہ شاکی تھے
کہ نانک دیو سب کو چھوڑ کر لالو کے کیوں ٹھہرے
ہتک سب کی ہے اسمیں نیچ کو عزت ہوئی حاصل
اسے مہماں نوازی کی جو فوقیت ہوئی حاصل

.....

ملک بھاگو کے گھر میں اتفاقاً ایک دعوت تھی
گورو نانک سے بھی تشریف لانے کی گذارش کی
در اندازوں کی بن آئی ملک بھگو کو بھڑکایا
سبھی آئے مگر دعوت میں اک نانک نہیں آیا
کہا قاصد سے جائے اور نانک کو بلا لائے
یہاں آ کر سبب وہ اپنی گستاخی کا سمجھائے
بلانے پر گورو نانک ملک بھاگو کے گھر آئے
مگر مٹھی میں لالو ہی کی وہ نان جویں لائے
ملک بھاگو نے غصے میں نہ آنے کا سبب پوچھا
رذیلوں کو شریفوں سے بڑھانے کا سبب پوچھا
بھری محفل کے مہمانوں نے نانک کی طرف دیکھا
وہاں آنکھوں میں ہمدردی تو ماتھے پر شرف دیکھا
گورو نے دوسری مٹھی میں لی بھاگو کی اک پوری
دبائیں مٹھیاں تو مل گئی تفسیر بھی اس کی
نظر آیا ادھر تو دودھ کے قطرے ٹپکتے تھے
ادھر پوری سے لیکن گر رہے تھے خون کے قطرے
ہر اک مہمان نے حیران ہو کر معجزہ دیکھا
ادھر آب بقا دیکھا ، ادھر خون وفا دیکھا
دکھایا فرق امارت اور محبت کی کمائی میں
خردمندوں نے پھیلا دیں یہ سب باتیں خدائی میں

شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے گورو نانک دیو جی کے حضور بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے گورو نجی کے عملی اقدام کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروانہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بدقسمت رہے آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا

ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

انبیاء کرام ،خلفاء اور اولیاء اللہ نے خدا کی وحدانیت و یکتائی کا تعارف کراتے ہوئے یہ باور کرایا کہ لائق عبادت صرف اور صرف خدا ہے اس کے باوجود اس بارش رحمت سے انسان فیض نہ اٹھا سکا جو انبیاء ،اولیاء اور ائمہ کی ذات والا صفات کے ذریعے ہوئی تھی کیونکہ وہ ایسی زمین تھی جو بارش رحمت سے فیض اٹھانے کے لائق ہی نہ تھی۔ایسے ماحول میں ہندوستان کی سرزمین ایسے گورو کی ذات سے روشن ومنور ہوئی جیسے آزر (جناب ابراہیم کے چچا) کا گھر نورِ ابراہیم سے روشن وتابناک ہوا۔بقول علامہ اقبال:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

علامہ اقبال کی اس نظم میں گورو نانک جی کو''مرد کامل'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے جو قابل غور وفکر ہے۔

گورو نانک جی نے اپنی تعلیمات کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں جو سعی کی اس میں انھیں کامیابی وکامرانی بھی نصیب ہوئی۔جس کے نتیجے میں دونوں مذہب کے انسان آج بھی گورو نانک جی کو عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی شان میں مختلف انداز سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔جیسا کہ منور لکھنوی لکھتے ہیں:

ہر شوالے میں تکریم نانک کی تھی
خانقاہوں میں تعظیم نانک کی تھی
پاک سے پاک تنظیم نانک کی تھی
درس نانک کا تعلیم نانک کی تھی

گورو نانک دیو جی نے اس عہد کی ضرورتوں کے مطابق عقیدۂ توحید کو پیش کیا جو اسلامی عقائد کی اصل ہے ۔ اسلام میں عقیدۂ توحید کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔عقیدۂ توحید یعنی تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا پروردگار عالم ہے اور وہ شکل وشمائل سے بالاتر ہے۔

مہدی نظمی کی ایک معرکتہ الآرا مثنوی''نذر نانک'' ہے جس میں گورو جی کی زندگی سے متعلق بیشتر واقعات اور پہلوؤں کو اس طرح نظم کیا گیا ہے کہ جو سکھ تواریخ اور عقیدے کے عین مطابق ہیں ۔''نذر نانک'' گورو نانک جی کی منظوم حیات ہی نہیں اگر گورو جی کی مکمل تاریخ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس مثنوی میں گورو نانک جی کی پیدائش کے قبل کے حالات سے لے کر ان کے آخری ایام تک کے تمام واقعات وحالات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔نذر نانک کا آغاز مہدی نظمی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

اے خدا میرے قلم کو کو قدرت تحریر دے
حسن دے طرز بیان کو، نظم کو تاثیر دے
نذر دینا ہے عقیدت، پیشوائے ہند کو
نظم کرنا ہے جمال رہنمائے ہند کو
رہنما جس نے دکھایا راستہ توحید کا
جس کو حاصل ہے شرف تہذیب کی تجدید کا
خضر منزل جو بنا ظلمات کی ہر راہ میں
جس نے پایا ایک جلوہ رام اور اللہ کا
وہ ہوا جس دور میں ظاہر وہ تھا دور سیاہ
جب تھے ہندو اور مسلماں ملک میں گم

مہدی نظمی کی کتاب''نذر نانک''اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے گورو نانک جی کو رسمی خراج عقیدت پیش نہیں کیا بلکہ ان کی زندگی اور خدمات کو تفصیلی طور پر نظم کر کے رہبری کا سامان بھی فراہم کیا۔

اردو زبان میں گورو نانک جی پر سب سے پہلی نظم کے خالق اٹھارہویں صدی کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی ہیں کہ جنھوں نے''گورو نانک جی کی مدح'' کے عنوان سے طویل مسدس کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔اردو میں یہ نظم اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ نظم عقیدت کی دنیا میں بے مثال ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سیکولر طرز فکر کے سبب بھی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

اس نظم میں گورو نانک جی کو مرد کامل کے بجائے ''کامل رہبر'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے:

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد، امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
اِن لطف وکرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اِس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو واہ گرو

مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم کے ہر بند کے چھٹے مصرع میں''ہردم بولو واہ گورو'' کا نعرہ گورو جی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے پر زور دیتا ہے۔سکھ تواریخ میں ہے کہ جب بابر نے ایمن آباد پر حملہ کیا تو تمام لوگوں کے ساتھ گورو نانک دیو جی کو بھی گرفتار کر لیا اور قیدیوں کو آٹا پیسنے کے لئے چکی دی گئی تو گورو نانک دیو جی کی چکی خود بخود چل رہی تھی۔اس واقعہ کی شہرت بابر تک پہونچی چونکہ وہ فقیر اور صوفیاء کا احترام کرتا تھا لہذا انھیں بھی ایک فقیر یا صوفی سمجھ کر اپنے پاس بلا لیا دربار میں شراب کا دور چل رہا تھا۔بابر نے دربار میں شراب کا جام ان کی خدمت میں پیش کیا۔انھوں نے کہا یہ شراب وہ ہے کہ جس کا نشہ اتر جائے گا لیکن ہم جو خماری یعنی خدا کی محبت کی شراب پیتے ہیں وہ خماری کبھی ختم نہیں ہوگی۔اس واقعہ کو نو بہار صابر نے بہت ہی خوبصورت پیرائے میں نظم کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

پا کے باہر کا اشارہ ساقئ زہرہ جمال
خدمت ستگر میں لے کر جام و مینا آ گیا
بندۂ درویش سے سن کر کلام دلگداز
سطوت شاہی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا
تو سمجھتا ہے مئے سامان عیش دو جہاں
ہم فقیروں کی نظر اس پر ٹھہرتی ہی نہیں
دو گھڑی کا نشہ ہے تیری شراب ناب میں

ہم جو پیتے ہیں وہ مے چڑھکر اترتی ہی نہیں

اردو وفارسی کے معتبر شاعر اور جپ جی صاحب کے مترجم گیانی نہال سنگھ عفیف نے ''پیغام نانک'' کے نام سے جو نظم کہی ہے وہ عقیدت کی شاعری میں لا جواب ہے۔ جس میں انھوں نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کے ختم کرنے کے سلسلے میں گورو نانک جی کے خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے ایسے وقت میں خدا سے انسانوں کو متعارف کرایا جب کہ اصنام کی پرستش بے حساب ہو رہی تھی۔ اس وقت جس کی لاٹھی اسی کے زور کی بات تھی ایسے ماحول میں گورو جی کو خدا نے بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھا سکیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ:

راج تھا جب خنجر وتلوار کا
نا تواں ظالم سے جب بیزار تھا
چھپ گیا جب راستی کا آفتاب
بادشاہ راجہ ہوئے جب سب قصاب
رشوتوں کا گرم جب بازار تھا
جبکہ حاکم خود ہی کج رفتار تھا
جب پرستش تھی روا اصنام کی
فکر نہ تھی جب خدا کے نام کی
زور داروں سے نہ تھی پرسش حساب
جب ہوا انصاف کا خانہ خراب
جس کی لاٹھی تھی اس کا زور تھا
ڈھور تھا انسان جو کمزور تھا
زور سے جب مر چکے انسان پر
زندہ عورت جلتی تھی شمشان پر
کرتا تھا انسان پر انسان جب
دیوی کے استھان پر قربان تب
تب تجھے بھیجا تھا اللہ پاک نے
اس خدا نے مالک افلاک نے

مندرجہ بالا کلام میں عفیف نے گورو جی کے عہد کی تصویر کشی کرتے ہوئے جس سادگی سے اشعار کو نظم کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اردو غزل اور نظم میں منفرد شخصیت کے حامل نند لال نیرنگ سرحدی نے گورو نانک جی سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے یہ یقین دلایا ہے کہ گورو

> مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم کے ہر بند کے چھٹے مصرع میں ''ہر دم بولو واہ گورو'' کا نعرہ گورو جی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے پر زور دیتا ہے۔
>
> سکھ تواریخ میں ہے کہ جب بابر نے ایمن آباد پر حملہ کیا تو تمام لوگوں کے ساتھ گورو نانک دیو جی کو بھی گرفتار کرلیا اور قیدیوں کو آٹا پیسنے کے لئے چکی دی گئی تو گورو نانک دیو جی کی چکی خود بخود چل رہی تھی۔
>
> اس واقعہ کی شہرت بابر تک پہونچی چونکہ وہ فقیر اور صوفیاء کا احترام کرتا تھا لہذا انھیں بھی ایک فقیر یا صوفی سمجھ کر اپنے پاس بلا لیا دربار میں شراب کا دور چل رہا تھا۔
>
> بابر نے دربار میں شراب کا جام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے کہا یہ شراب وہ ہے کہ جس کا نشہ اتر جائے گا لیکن ہم جو خماری یعنی خدا کی محبت کی شراب پیتے ہیں وہ خماری کبھی ختم نہیں ہوگی۔
>
> اس واقعہ کو نو بہار صابر نے بہت ہی خوبصورت پیرائے میں نظم کیا ہے۔

نانک جی نے عوام کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہوئے صدق ومحبت کا جو درس دیا وہ بے مثال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے توحید کا درس دے کر لوگوں کو صراط مستقیم دکھایا اور حق پرستی کا ایسا سبق پڑھایا کہ جس کے لئے سکھ قوم ان کی ہمیشہ ممنون کرم رہے گی:

افق ہند پہ ظلمت کے نشاں تھے ظاہر
یعنی اس باغ میں آثار خزاں تھے ظاہر
حق پرستی کی جگہ وہم و گماں تھے ظاہر
جس قدر ظلم تھے سارے وہ یہاں تھے ظاہر
تو یہاں آیا تو پھر ہند کا تارا چمکا
ظلمتیں دور ہوئیں ،بخت ہمارا چمکا

گورو نانک جی کی جاذب نظر شخصیت اور کردار واعمال کی بدولت ان کے وصال کے بعد ہر انسان ان کو اپنا کہہ رہا تھا یہی نہیں بلکہ ان کے آخری رسومات کے فریضے کو انجام دینے کے لئے باہم نزاع کرنے سے بھی گریز نہ تھا لیکن وہ تو کسی خاص مذہب وملت کی رہنمائی کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو صحیح اور سچا راستہ دکھانے کی غرض سے آئے تھے۔ لہٰذا بقول وید پال کوشل انبالوی:

تو نے تیرا ،تیرا کہہ کر سب دیا غلہ لٹا
اور جب پڑتال کی تو ایک دانہ کم نہ تھا
نعش پر تیری لڑے تھے مسلم وہندو مگر
کچھ نہ تھا زیر کفن گلہائے خنداں کے سوا

ان شعراء کے علاوہ علامہ منور لکھنوی ،ابرار احسنی گنوری، ساحر ہوشیار پوری، امر سنگھ منصور، صغیر احمد صوفی ، ،گور بچن سنگھ کوشاں ، مسرور لکھنوی ،آر ،ایس، کوثر، ست پرکاش سالک، ہری چند گل، طالب شملوی ، گیان چند منصور، عشرت لدھیانوی اختر رضوانی، رضا امروہوی، ظہور احمد سہارنپوری، محمد اسحاق، احمد علی فکر عظیم آبادی، اللہ یار خاں جوگی، محمود قادری، ہاشمیہ بیگم اصغر بہرائچی، ابوظفر نازش وغیرہ نے بھی گورو نانک جی کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے جو اردو زبان کے انمول خزینے ہیں۔ مختصر یہ کہ گورو نانک دیو جی کی روحانی شخصیت کو اردو کے شعراء نے اس قبیل سے پیش کر کے اردو شاعری کی روشنی میں اضافہ کرتے ہوئے گورو نانک دیو جی کے عقیدت مندوں کے لئے اردو زبان میں ان کو یاد کرنے کی ایک نئی لطافت سے بھی آشنا کرایا ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر نریش
۱۷۹، سیکٹر ۱۷، پنچ کولہ (پنجاب)
پن: 134109

سکھ مت اور تصوف

سکھ مت اور تصوف کے درمیان جو رشتہ ہے اس کو بیان کرنے کے لئے میں اپنی بات ایک شعر سے شروع کرتا ہوں۔ یہ شعر اس شاعر کا ہے جس نے اپنے بارے میں کہا تھا 'من برہمن زادہ رمز آشنائے رومی و تبریز است' (میں برہمنوں کی اولاد ہوں اور رومی و تبریز کے رموز سے واقف ہوں) ویدوں، اُپنشدوں کا سنسکار لے کر ماہر تصوف بننے والے شاعر مشرق علامہ اقبال نے بابا نانک کے متعلق کہا تھا؛

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اس شعر میں تین اشارے پوشیدہ ہیں۔ پہلا اشارہ شعر کے پہلے لفظ 'پھر' میں موجود ہے کہ ہندوستان ہمیشہ ہی سے توحید یعنی 'ایکو برہم دوتیا ناستی' (خدا ایک ہے دوسرا کوئی نہیں ہے) پر ایمان لاتا رہا ہے لیکن بابا نانک کے زمانے تک آتے آتے یہ ملک کرم کانڈ کے چکر میں پڑ کر توحید کے فلسفہ کو بھول چکا تھا اور لوک پرلوک کے ان سپنوں میں مگن تھا جو براہمن واد دکھا رہا تھا۔ معاشرہ کا خواب و خیال میں غلطاں ہونا دوسرا اشارہ ہے۔ تیسرا اشارہ یہ ہے کہ ایک مرد کامل نے گہری نیند سو رہے ہندوستانی معاشرے کو بیدار کیا۔ وہ مردِ کامل تھے بابا نانک۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر علامہ اقبال نے بابا نانک پر نظم نہ بھی لکھی ہوتی تو اس سے نہ تو بابا نانک کی عظمت کو کچھ فرق پڑنا تھا اور نہ اقبال کی شاعرانہ بالیدگی پر کوئی اثر پڑنا تھا لیکن شاہین کے تصور کے ذریعہ اقبال کو جس مردِ کامل کی تلاش تھی وہ تاریخ کے اوراق میں اور عوام کے دلوں میں موجود تھا تو اقبال کے لئے ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ سکھ مت اور تصوف کا باہمی رشتہ تو اسی بات سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ بابا نانک نے خود پاک پٹن جا کر بابا فرید کی درگاہ کے بارہویں خلیفہ شیخ ابراہیم سے بابا فرید کا کلام حاصل کیا تھا اور گورو ارجن دیو نے اس کلام کو سکھوں کی مقدس کتاب 'گرنتھ صاحب' میں شامل کیا تھا۔ پیر بدھن شاہ اور بابا نانک کی متعدد ملاقاتیں بھی ہر دو عقائد کے مابین قریبی تعلق کی تصدیق کرتی ہیں۔

صوفی بزرگوں اور سکھ گروؤں کی آپسی محبت اس وقت مثالی بن گئی جب حضرت میراں بھیک نے اس روز مغرب رو ہونے کے بجائے مشرق رو ہو کر نماز ادا کی جس روز پٹنہ میں گورو گوبند سنگھ کی ولادت ہوئی۔

حضرت کی اس روایت شکنی پر حیراں مریدوں کے استفسار کرنے پر آپ نے فرمایا کہ آج مشرق میں نورِ الٰہی کا تولد ہوا ہے۔ اگلی صبح وہ کئی مریدوں کو ساتھ لے کر پٹنہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ پاپیادہ سفر طے کرتی ہوئی فقیروں کی یہ ٹولی جب پٹنہ پہنچی تو طفل گورو اکیس روز کے ہوگئے تھے۔ حضرت میراں بھیک نے طفل گورو کا دیدار کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر اس زمانے میں نوزائیدہ بچے کو چالیس روز تک زچہ کے کمرے سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ فقیروں کی محبت، کاوش اور دلبستگی کا احترام کرتے ہوئے طفل گورو کے ماموں کرپال چند مروجہ روایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بچے کو زچہ کے گھر سے باہر لے آئے۔ حضرت میراں بھیک نے دو کوزے طفل گورو کے سامنے کر دئے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو بتا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک کوزے میں دودھ رکھا گیا تھا اور دوسرے میں پانی۔ طفل گورو نے اگر پانی والے کوزے پر ہاتھ رکھا تو وہ بڑا ہوکر مسلمانوں کا پیر بنے گا اور اگر دودھ والے کوزے پر ہاتھ رکھا تو ہندوؤں کا گورو بنے گا۔ طفل گورو نے اپنے ماموں کی باہوں میں لیٹے لیٹے ہی بیک وقت دونوں کوزوں کو چھو دیا۔ حضرت کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ آپ نے اعلان کیا کہ یہ بچہ بڑا ہوکر 'سانجھا پیر' بنے گا۔

دونوں عقیدوں کی قربت اس واقعہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ پیر بدھو شاہ نے مع اپنے ۷۰۰ رمریدوں دو بھائیوں اور چار بیٹوں کے بھنگالی کی جنگ میں شریک ہوکر پہاڑی راجوں کے ساتھ برسرِ پیکار گورو گوبند سنگھ کی فوج کو عملی تعاون بہم پہنچایا تھا۔ اس جنگ میں پیر صاحب کے دو بیٹوں، ایک بھائی اور متعدد مریدوں نے جامِ شہادت پی کر گورو گوبند سنگھ کے دھرم یدّھ میں محبت کا دھرم نبھایا تھا۔

ہر دو عقیدوں کا رشتہ اس وقت اپنی بلندی کو جا پہنچتا ہے جب سکھوں کے مکہ مدینہ، ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد صوفی بزرگ میاں میر کے دست مبارک سے رکھا جاتا ہے۔

باہمی رشتوں کی کہانی سے آگے چلیں تو ہمیں تصوف اور سکھ فلسفوں کے درمیان بھی خاصی یگانگت دکھائی دیتی ہے۔ متعصب حکام کے ہاتھوں پھانسی کے پھندوں پر جھولنے اور اسلام مخالف گردانے جانے کے باوجود اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ صوفیائے کرام صاحب ایمان وصفا مسلمان تھے۔ کلمے پر ان کا ایمان تھا۔ کلمہ اسلامی فلسفے کی بنیاد ہے۔ کلمے کا نصف اول 'لا الٰہ الا اللہ' ہے جس کا مطلب ہے 'نہیں، اور کوئی خدا نہیں ہے ایک خدا کے سوا' ادھر گورو بانی خدا کے تصوف کی وضاحت 'اک اونکار' کہہ کر کرتی ہے۔ گورو بانی کے مطابق خدا کرتا ہے (خالق) ہے، نربھے (بے خوف)، نرویر (بے عناد) ہے۔ صوفیا کا رب العزت بھی 'لاشریک' ہے۔ اس کی خدائی میں کسی دوسرے کو دخل حاصل نہیں ہے۔ وہ 'لامحدود' ہے۔ اس کے اختیار کی کوئی حد نہیں ہے۔ گورو بانی اسے 'آد' کہتی ہے کہ اس سے قبل نہ کسی شئے کا وجود تھا اور نہ اس کی رضا کے بغیر کسی شئے کا وجود ممکن ہے۔ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ 'اجنما' ہے۔ گورو بانی کے مطابق:

ایک اونکار اور نہیں دوجا
نازک ایک سمائی

(اے نانک جو محض ایک کی عبادت کرتے ہیں اور کسی دوسرے خدا کے وجود سے منکر ہیں، وہ اسی کی ذات میں مدغم ہوجاتے ہیں۔)

خدا کے ایک ہونے پر اپنے اعتقاد کو مستحکم کئے بغیر کوئی انسان مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ چونکہ اس استحکام کی نفی سے تکبر کا جنم ہوتا ہے۔ جب تک وحدانیت پر یقین مستحکم نہیں ہوتا۔ تب تک انسان کو اس کے ہر جگہ پر موجود ہونے کا، اسی کے قادر و عادل ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔ اس استحکام کے آتے ہی تمام اوہام ختم ہوجاتے ہیں۔ جب ایک 'اونکار' کا 'مول منتر' انسان کے دل میں بس جاتا ہے تب وہ وہم و گمان کی زد سے پرے نکل جاتا ہے۔

ایکو ایک کہے ہر کوئی ہوئے گرب نہ بیاپے
انتر باہر ایک بچھانے یوگھر محل سنجھاپے

(تسلیم تو سب کرتے ہیں لیکن انانیت اور غرور میں مبتلا رہتے ہیں۔ جو انسان اندر باہر سے اس کو ایک مانتا ہے۔ اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ مقام الٰہی کہاں پر ہے۔)

بابا نانک نے اسی نکتے کو بہت آسان لفظوں میں بیان کیا ہے:

ہوئے ناوے نال ورودھ ہے
دوئی ہن وسہو ایک ٹھائی

(تکبر اور ذکر الٰہی دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی جگہ پر نہیں رہ سکتے۔)

'اکال استت' میں تکبر کی نفی کے لئے اسی طرح دل میں ایک اونکار کو بسانے کا درس دیا گیا ہے۔ جس طرح صوفیائے کرام نے کلمے پر ایمان لانے کی تلقین کی ہے۔

یہاں 'ایک اونکار' کے مفکرانہ پس منظر کو سمجھ لینا مناسب ہوگا۔ بابا نانک نے 'اونکار' سے پہلے 'ایک' لکھ کر کائنات کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ صفر یا زیرو خلا کی علامت ہے۔ اس لئے بابا نانک نے صفر کا استعمال نہ کرکے 'ایک' کا استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مرئی اور غیر مرئی جو کچھ بھی ہے، سب اسی ایک کی توسیع ہے۔ اپنی مرضی سے یہاں پر نہ کوئی شئے وجود میں آئی ہے، نہ آسکتی ہے۔

فلسفۂ تصوف میں اس نکتے کو تین صورتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے جس کو فلسفۂ جبر و قدر کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ خیال غالب آجاتا ہے کہ انسان ایک انتہائی بے بس ذی روح ہے۔ اس خیال کو جبر کہتے ہیں اور اس کے ماننے والوں کو 'جبریہ' کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا ہم سب کا اور دیگر

تمام اشیاء کا خالق ہے لیکن اپنے اعمال کے لئے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہمارے افعال کا خدا کی رضا سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم اپنے ہر فعل کو اپنے ادراک سے انجام دیتے ہیں۔ اس خیال کو 'قدر' کہا گیا ہے اور اس کے ماننے والے 'قدریہ' کہلاتے ہیں۔ تیسری صورت کے مطابق ہمارے تمام اعمال کا مالک خدا ہے لیکن اعمال کا باعث خود ہم ہیں۔ اسی لئے اعمال کی جواب دہی ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس خیال کو 'بین الجبر والقدر' کہا گیا ہے۔ گورو بانی میں ان تینوں صورتوں کا اظہار ہوا ہے۔

نانک آپی کرائے کرے، آپی حکم سوارن ہارا

(اے نانک! کرنے کرانے والا وہ خود ہے جو اپنے حکم کو عمل کی صورت عطا کرتا ہے۔)

یہ کہہ کر گورو بانی جبریہ عقیدہ کے مشابہ ہو جاتی ہے کہ انسان کے اپنے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو خدا کی رضا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ کوئی عمل، کوئی فعل اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ صوفیاء کے اس عقیدے کو میر تقی میر نے اس طرح بیان کیا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

یہی رمز بابا نانک بہت پہلے سمجھا گئے تھے کہ

جیہی تو متی دیئی تیہی کو پاوے
تدھ آپے بھاوے، توئے چلاوے

(خدا جیسی ترغیب دیتا ہے، انسان کی عقل ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، عمل کرا دیتا ہے۔)

گورو بانی فلسفۂ قدر کے بھی منکر نہیں ہے۔ 'نانک کرنا جن کیا سوئی سار کریئ' (اے نانک! جس نے جو عمل سرانجام دیا ہے، وہی اس کے لئے جواب دہ ہے۔) جیسے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورو بانی اس کا اعتراف کرتی ہے کہ اعمال بد کی ترغیب خدا جیسی پاک ہستی کا دینا ناممکن ہے۔ یہ تو موہ مایا ہے جو انسان کو بداعمالی کی طرف راغب کرتی ہے۔ اسی 'موہ مایا' کو تصوف میں 'شیطان' کہا گیا ہے جس سے محفوظ رہنے کا درس گورو بانی بھی دیتی ہے اور تصوف بھی۔

گورو بانی میں فلسفۂ بین الجبر والقدر سے بھی انکار نہیں کیا گیا ہے۔ بقول بابا نانک:

آپی کراوے آپی ہئو کے سیو کری پکار
آپی کراوے منگسی آپے کرائے کار
جو تہی بھاوے سوئی تھئے حکم کرے گا وار
آپی چھڑاے چھٹیے آپے بخش ہار

(خدا ہی ہے جو اعمال سرزد کراتا ہے اور پھر خود ہی ان اعمال کا حساب ہم سے طلب کرتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو وہ چاہتا ہے مگر انسان اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتا رہتا ہے۔ وہ بخشنے والا بھی ہے۔ وہ انسان کو نجات دینا چاہے تبھی نجات ممکن ہے) حساب تو اسی کا دینا ہے کہ ہم نے زندگی میں کیا کچھ اس کی رضا کے مطابق کیا ہے اور کیا کچھ شیطان کے بہکاوے میں آ کر کیا ہے۔

بابا نانک سے لے کر گورو گوبند سنگھ تک محبت کا جو رشتہ صوفیا کرائے اور گورو صاحبان کے درمیان رہا ہے اور جس طرح یہ لوگ روحانیت کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے ہیں، اس کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں گورو صاحبان کے کلام میں تصوف سے متعلق متعدد الفاظ بھی ملتے ہیں اور متعدد اسلامی عقائد بھی۔ بابا نانک کے کلام میں ان کا 'اکال پرکھ' رحیم بھی ہے، پروردگار بھی، کریم بھی ہے، بے پروا بھی، قادر بھی ہے، رب بھی، دانا بھی ہے، بینا بھی۔ (سو قادر کریم دے جیسا رزق سمباہی) اسلامی عقائد میں سے شیطان، حرام و حلال، بہشت و دوزخ جیسے عقائد گورو بانی میں متعدد مقامات پر اپنی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

تہیہ کری رکھے پنج کری ساتھی
ناؤ سیطان متی کٹی جائی

(تم نے تیس روزے بھی رکھے، پانچوں نمازیں بھی پڑھیں لیکن شیطان ہمیشہ تمہاری نیت پر اثر انداز ہوتا رہا۔)

جو جیوے پت لتھی جائی
سو حرام جیتا کہو کھائی

(جس شخص کی زندگی بے عزتی کا شکار ہو جاتی ہے اس کا کچھ بھی کھانا پینا حرام ہوتا ہے۔)

حق پرایا نانکا اس سئور اس گائے

(دوسرے کی حق تلفی کرنا مسلمان کے لئے سور کھانے کے مترادف ہے اور ہندو کے لئے گؤکشی کے برابر ہے۔)

تھاؤ نہ پائنی کوڑیار مکھ کالے دوزخ چالیا

(غلط لوگوں کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔ وہ اپنا روسیاہ لے کر دوزخ کو چل دیتے ہیں۔)

ننگا دوزخ چالیا تا دسے کھرا ڈراؤنا
کری اوگن بچھوتاونا

(غلط لوگ بے پردہ ہو کر دوزخ میں جاتے ہیں اور خوفزدہ کھڑے رہتے ہیں اور اپنی بداعمالی پر بچھتاتے رہتے ہین۔ شاعر نانک نے تو صوفیا کرام کے عقائد ہی میں شراکت نہیں کی بلکہ ان کی زبان تک کو اپنا لیا تھا۔)

یک عرض گفتم پیش تو در گوش کن کرتار
حق کبیر رحیم تو بے عیب پروردگار
دنیا مقام فانی تحقیق دل دانی
مم سرموئی عزرائیل گرفتہ دل پیچ جانی

غرض یہ کہ مذاہب مختلف ہو سکتے ہیں، رسومات دینوی مختلف ہو سکتی ہیں لیکن جہاں تک روح اور اس کے ماخذ کا تعلق ہے، روح کے پھر سے اپنے اصل کو پہنچ کر وہی صورت اختیار کرنے کا تعلق ہے جو اس کے دنیا میں آنے سے پہلے تھی، تو تمام مذاہب کی دائمی حقیقتیں ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور وہ نقطہ ہے روحانیت، ادھیاتم۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں پر آ کر سکھ مت اور تصوف ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

❑❑❑

پروفیسر شمیم حنفی
B-114، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی
رابطہ: 9818524803

میرا پہلا اسکول

اس شہر کی آبادی مشکل سے ساٹھ پینسٹھ ہزار کی رہی ہوگی۔ ہر طرف قصبے اور گاؤں دیہات کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ ابھی آزادی کے آنے میں سال ڈیڑھ سال کا وقت باقی تھا۔

ہمیں جولائی کے مہینے کی شروعات کے ساتھ ایم ایس وی انٹر کالج پہنچا دیا گیا۔ ایم ایس وی انٹر کالج کی اجلی، خوبصورت اور کشادہ عمارت گھر سے کوئی میل بھر کی دوری پر تھی۔ پاس پڑوس کے دو چار اور لڑکے بھی وہاں جاتے تھے، اپنا بستہ سنبھالے پیدل چلتے ہوئے۔ اس وقت تو وہاں رکشے بھی نہیں چلے تھے، نہ بجلی آئی تھی۔ ہمارے گھر سے اسکول کے راستے میں تحصیل پھر شہر کا صدر اسپتال واقع تھا پھر تھوڑا آگے چل کر بیچ میں ریلوے اسٹیشن پڑتا تھا۔ پھر کچی سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ۔ اسٹیشن سے ذرا آگے ایک بوسیدہ سی عمارت میں دس بارہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک قطار میں۔ یہ لڑکوں کا ہاسٹل تھا۔ ہاسٹل سے ملحق ایک کشادہ بنگلہ نما گھر تھا۔ پھل دار پیڑوں اور موسمی پھلوں کی کیاریوں سے گھرا ہوا، جہاں ہندی کے مشہور کوی پنڈت رام نریش ترپاٹھی رہتے تھے۔ بہت گورے چٹے، کھدّر کی دھوتی اور کرتے میں ملبوس، ہمیشہ نکھرے نکھرے سے اور بہت نرمی سے باتیں کرنے والے۔ سوائے اس وقت کے جب پاس سے گزرنے والے لڑکوں میں سے کوئی ان کے باغ میں چوری چھپے نہ گھس آیا ہو اور جنگل جلیبی، امرود یا جامن یا کروندے چرا رہا ہو۔ ترپاٹھی جی پکے کانگریسی تھے۔ گاندھی جی نے انہیں اودھی، بھوج پوری لوک گیتوں کی کھوج اور تدوین و ترتیب پر مامور کیا ہوا تھا۔

ہم روز ہی اس مہم کو سر کرتے ہوئے ایم ایس وی کالج پہنچتے تھے جہاں پہلی کلاس اردو کی ہوتی تھی۔ ہمارے استاد سید توکل حسین صاحب تھے۔ وہ شہر کے سب سے معروف شاعر بھی تھے اور نیرؔ تخلص کرتے تھے۔ اس کے ہم عصر شاعروں میں جو اس خاموش سی بستی کی شہرت اور چہل پہل کا ذریعہ بنے، ان میں فکریؔ سلطانپوری، محور سلطانپوری صاحب، عبدالحئی کامل، جدو راج بلی عیش، احمد حسین احمد، بابو کرونا شنکر اور دیسی صاحب کے کلام کی دھوم دور دور تک تھی۔ دیسی صاحب جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے، اودھی میں شعر کہتے تھے اور پہلے بوکھلؔ تخلص کرتے تھے۔ جگر صاحب نے ان کا تخلص دیسیؔ کر دیا۔ لکھپت رائے سکسینہ محورؔ پیشے سے وکیل تھے۔ نیرؔ صاحب سے دوستی تھی اور شاعری کے پرانے اسالیب پر مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ پڑھتے بھی خوب تھے، زانو پیٹ پیٹ کر۔

ایم ایس وی کالج میں اردو کے ایک اور استاد تھے۔ پنڈت داتا دین تیواری مگر وہ اونچی جماعتوں کو پڑھاتے تھے۔ فارسی کے استاد مولوی مغیث الدین صاحب تھے۔ ان دنوں اردو دفارسی کے شعبے اور اساتذہ اسکولوں کالجوں میں بے حرمت نہیں ہوئے تھے۔ نیر صاحب اور پنڈت داتا دین تو یوں بھی اپنی خوش لباسی اور نفاست پسندی کے لحاظ سے اسکول بھر میں ممتاز تھے۔ دونوں سر سے پیر تک سفید پوش، بہت متین اور اسکول کے نظام اور روز مرہ کے معاملات میں گہرا عمل دخل رکھنے والے۔ ہر طالب علم چاہے کسی مضمون کا ہو، ان دونوں سے ڈرتا تھا۔

نیّر صاحب بظاہر سخت گیر بھی تھے۔ مجال ہے کہ کوئی طالب علم ان کی کلاس میں ذرا بھی دیر سے داخل ہو۔ سب کی روح کانپتی تھی لیکن عجیب بات ہے کہ کلاس یا اسکول سے باہر نیّر صاحب کی شخصیت ایک دم تبدیل ہو جاتی تھی۔ بات چیت کے دوران مسکرا بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھار اردو کے بجائے اودھی میں بھی چل پڑتے تھے۔

نیّر صاحب کا شمار ہماری بستی کے معروف لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ شہر کے ایک کنارے پر چھوٹی سی ڈھلان سے ملا ہوا ان کا گھر تھا۔ ہمارا آنا جانا ان کے گھر بھی تھا۔ وہ بھی گاہے گاہے ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ ابا جان کے پاس، ان سے نیّر صاحب کی بے تکلفی تھی۔ ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور بات چیت کے دوران دونوں کے قہقہے بھی سنائی دیتے تھے۔

نیّر صاحب سے قربت ہمارے کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں بڑھی۔ وہ شمع ادب کے نام سے ایک رسالہ نکالنے لگے تھے اور ہم نے ان کی تاکید پر کچھ لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔

میرے شروعاتی دور کے افسانے نیر صاحب نے اپنے رسالے شمع ادب میں شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور آج انہیں کی تربیت کا اثر ہے کہ میں جو بھی ہوں ان کی دعائیں میرے شامل حال ہیں۔ نیر صاحب کی چند غزلیہ اشعار جو مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں، پیش خدمت ہیں:

اک اضطراب شوق مسلسل ہے کائنات
کس کو نہیں ملا مری آشفتگی سے فیض

سجدے میں ہو جبیں کہ جبیں میں سجود شوق
پاتا ہے آستاں بھی میری بندگی سے فیض

ملتا رہا جو یوں ہی غم عاشقی سے فیض
پہنچے گا حشر کو بھی مری زندگی سے فیض

جب تشنہ لبی یوں عام نہ تھی وہ دور تو اب آنے سے رہا
ساقی کا کرم کیسا ہی سہی ہر جام کو چھلکانے سے رہا
ہے حسن سراپا خود بینی اور عشق ہمہ تن خودداری
وہ میری طرف آنے سے رہے میں انکی طرف جانے سے رہا
ہنستے ہی رہے ہم اے نیر واعظ کے فریب فردا پر
یاں دیر و حرم کی سیر بھی کی اور ربط بھی میخانے سے رہا

نیّر صاحب کی اہلیہ جنہیں ہم پھوپھی جان کہتے تھے، اس قربت میں مستقل اضافے کا سبب بنیں۔ وہ ایک خوش ذوق خاتون تھیں، شعر و سخن سے شغف رکھنے والی اور نہایت نستعلیق گفتگو کرنے والی۔ مجروحؔ صاحب بمبئی سے جب بھی آتے، نیّر صاحب کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتے تھے اور ان کا قیام بھی نیر صاحب کے یہاں ہوتا تھا۔ ان دنوں شہر کا ادبی معاشرہ چمک اٹھا تھا۔ روز کہیں نشست، کہیں دعوت تو اضع کی تقریب۔ ایک مرتبہ تو مجروح صاحب آئے تو نیّر صاحب نے پورا مشاعرہ کر ڈالا۔ رودر نگر میں ڈاکٹر اختر صاحب کے گھر پر۔ الٰہ آباد سے فراق صاحب بھی آگئے۔ لوگوں نے جی بھر کے فراق صاحب اور مجروح صاحب کا کلام سنا۔ مقامی شاعروں نے بھی خوب داد حاصل کی۔

اس زمانے میں ہمارے شہر کا ادبی ماحول بہت خوبصورت اور جاندار تھا۔ دور دراز علاقوں سے مشہور شعرا بھی آتے رہتے تھے۔ جگر صاحب، جن کا قیام گونڈے میں تھا، کئی بار آئے اور خوب چہل پہل رہی۔

سلطانپور کے ادبی ماحول کو نکھارنے، شہرت دلانے اور اس کی عمومی سطح کو بلند کرنے میں سب سے موثر رول نیّر صاحب نے ادا کیا۔ ان کی ادبی صحافت کے ساتھ ساتھ ان کی شعر گوئی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ وہ مذہبی، ثقافتی تقریبات میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں ایک حصہ نعت و منقبت اور رثائی کلام پر بھی مشتمل ہے مگر نیّر صاحب کے شعری مزاج کی ترجمانی سب سے زیادہ ان کی غزلوں میں ہوئی ہے۔ ان کی غزلیں کبھی بھی رسمی مضامین اور روایتی موضوعات تک محدود نہیں رہیں۔ شاعری نیّر صاحب کے لئے صرف صناعی نہیں تھی۔ انہوں نے بڑی معنی آفرینی طبیعت پائی تھی اور اپنے عہد کی ترقی پذیر حسیت سے ان کا ذہن خوب مناسبت رکھتا تھا۔ اس رمز کو سمجھنے کے لئے نیّر صاحب کے کلام سے براہ راست تعارف ضروری ہے۔

ان کی سنجیدہ نورانی صورت آج بھی آنکھوں میں پھرتی ہے۔ لکھنؤ ناکے چوراہے سے ذرا آگے، ہادی کمپاؤنڈ میں انہوں نے ایک سادہ مگر خاصہ کشادہ مکان بنوا لیا تھا۔ سفید کرتے پاجامے اور کسی خاص تقریب میں شریک ہونا ہو تو اسی کے ساتھ ساتھ سفید شیروانی میں ملبوس، دھیمے متوازن قدموں سے چلتے ہوئے وہ اپنے نیم خاموش شہر میں بھی دوسروں سے زیادہ خاموش، پرسکون اور ممتاز نظر آتے تھے۔ ایک عجب انوکھی شریفانہ وضع کے ساتھ انہوں نے زندگی گزار دی۔ اب تو اس بستی کا حلیہ بھی بہت بدل گیا ہے۔ مگر سلاطین شرقی کی یادگار وہی بستی نیّر صاحب کے اٹھتے ہی ادھوری سی ہو گئی تھی۔ آج بھی ادھوری ہے۔ اب نہ وہ دور ہے، نہ وہ بستی اور نہ وہ لوگ۔

❑❑❑

شہباز عالم
A-129، کرشچین کالونی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
رابطہ: 9415284215

اودھ کے غیر مسلم شعراء کی ادبی خدمات

مہاجرین شعراء اور فنکاروں کا اودھ میں آمد کا سلسلہ شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا لیکن اصل میں ادبی ارتقا عہد آصف الدولہ سے شروع ہوتا ہے جب انہوں نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

قلیل عرصہ میں آصف الدولہ کی فیاضی وادب نوازی کی اتنی دھوم ہوئی کہ بہت سے ادیب وفنکار کشاں کشاں لکھنؤ چلے آئے۔ اس طرح لکھنؤ شہر علم وادب کا گہوارہ بن گیا۔ میرؔ وسوداؔ ایسے باکمال اساتذہ آئے اور یہاں کے ادبی ماحول پر چھا گئے۔

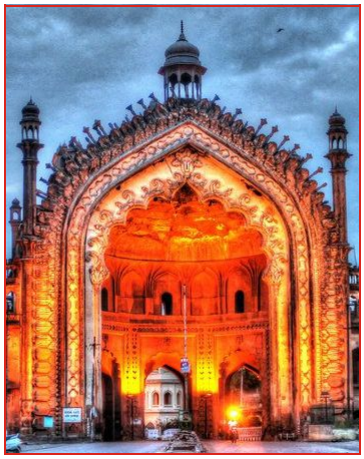

کچھ ہی عرصہ میں انشاء و مصحفی بھی یہاں آ گئے یہ لوگ مختلف طرز سخن کے مالک تھے اور یہ کہنا غلط نہ گا کہ دبستان لکھنؤ میں شاعری کی بنیاد انھیں دونوں اساتذہ کے ذریعہ پڑی رہی اس طرح لکھنؤ میں شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا تھا۔ جس میں خالص مذاق لکھنؤ کی ابتدائی شان نظر آتی ہے۔ اسی دور میں آتش وناسخ نے نزاکت خیال اور لطف بیان کے جوہر دکھائے اور زبان اردو کو خوب سنوارا۔ یہ دور انھیں خصوصیات کے لئے مشہور ہے۔ اس دور میں نسوانی لوازمات کی جانب زیادہ توجہ ہو گئی۔ کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی زیادہ پائی جانے لگی۔ شاعری میں روحانیت اور عمق کا فقدان ہو گیا۔ زیادہ تر شعراء دربار سے وابستہ ہونے کی بنا پر اپنی آزادئ خیال کو کام میں نہ لا سکے۔

وہ اپنے سرپرستوں کی خوشی کو مقدم رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں تصوف اور افکار عالیہ کی کمی ہو گئی۔ وہ زمانہ شعریت میں مکمل سرشاری کا تھا۔ اسلئے زلف وشانہ کی شاعری میں ضرورت سے زیادہ نسوانی جزبات کی آمیزش ہو گئی تھی۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد یعنی تیسرے دور کی شاعری میں اس طرز کے خلاف محاذ آرائی ہوئی اور چوتھے دور میں اردو زبان اور شاعری معراج کمال تک پہنچ گئی۔ ان چاروں زمانوں میں غیر مسلم شعرائے نے زبان وادب کی بھرپور خدمات انجام دیں۔

ابتدائی دور میں جو ادیب وفنکار لکھنؤ آئے رائے سرب سکھ دیوانہؔ کا نام بڑی عظمت کا مالک ہے۔ فارسی وارد دو دونوں میں شعر کہتے تھے اور کثیر التلامذہ تھے ان کے شاگردوں میں راجہ جسونت سنگھ پروانہؔ، جعفر علی حسرتؔ اور میر حیدر علی حیرانؔ شامل تھے ان تینوں شعراء کا شمار اردو اساتذہ کی صف اول میں ہوتا تھا۔

دیوانہؔ کی ضرب المثال رباعی ملاحظہ ہوں

وہ لوگ کہاں کہ باشی کیجئے
وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے
اک گوشے میں اپنے آہ بیٹھے تنہا
اب ناخن غم سے دل خراشی کیجئے

اسی ابتدائی دور کے ہندو شعراء کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے اکثریت مصحفی کے شاگردوں کی تھی۔لیکن ان کے کلام کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی مصحفی کے خشک رنگ کو اختیار نہیں کیا۔ بظاہر انہوں نے اپنے استاذ سے فن عروض کی تعلیم حاصل کی لیکن اپنے مذاق ومزاج کی تربیت علیحدہ ہوکر کی۔

اودھ کے فرماں رواں عقیدۃ شیعہ تھے۔محرم میں عزاداری اور تعزیہ داری ان کے مذہب کا اہم جز تھا۔ یہ لوگ وسیع النظر تھے تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بسنت اور ہولی ان کے درباروں میں دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ ہندو شعراء کے یہاں آل رسول سے عقیدت کی مثالیں ملتی ہیں بعض اشعار تو زبان زدعام وخاص تھے۔

انیسویں صدی کے ہندو شعراء کی ادبی خدمات سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں جسمیں راجہ جسونت سنگھ پروانہؔ اہم نام ہے۔ پروانہؔ کی خوب روئی کے متعلق تذکروں میں لکھا ہے۔

''پروانہؔ ایک جوان خرم وشگفتہ،خوش تمثال پری جمال تھے''

(تذکرہ شعرائے ہنود)

پروانہؔ کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں مشق سخن کرتے تھے اردو زبان میں صاحب دیوان تھے۔ مصحفی کے بیان کے مطابق پروانہ نے شاعری کی ابتداء فارسی زبان سے کی اور سرب سکھ دیوانہؔ سے اصلاح لیتے تھے۔اپنا کلام مرزا قتیل کی معرفت مصحفی کو شاہ جہاں آباد ارسال کرتے تھے۔مصحفی کے لکھنؤ آجانے کے بعد انھوں نے اردو زبان میں طبع آزمائی کی اور مصحفی کی شاگردی اختیار کرلی۔ پروانہؔ کے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ضعف ہے غش ہے ناتوانی ہے
بن تیرے موت زندگانی ہے
کون مدفون ہے چمن میں صبا
جس کی تربت پہ گل فشانی ہے

لالہ کانجی مل صباؔ بلند پایہ شاعر دیوانہ اور پروانہ کے ہم عصر تھے صباؔ کے مصحفی کے دیرینہ تعلقات تھے وہی ان کی شاعری کے محرک اور استاد ہوئے۔ صباؔ کا سنہ ولادت وفات نیز دیوان کا کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن مختلف تذکروں میں ان کا کلام ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں سوز وگداز ہے۔زبان سادہ وسلیس ہے مضمون آفرینی اور تخیل کی بلندی کے علاوہ پندونصائح کی چاشنی بھی موجود ہے۔ چند اشعار پیش نظر ہیں۔

مجلس سے اٹھ کے جب وہ رشک قمر گیا ہے
اپنا تو روتے روتے نورِنظر گیا ہے
کیا سحر کہ جا کر واں ہی کا ہو رہا ہے
اسی کی گلی میں یاں سے جو نامہ بر گیا ہے

اسی طرح چھنولال دلگیرؔ کا ذکر مرثیہ گوشعراء کے ذیل میں تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن وہ ابتداً غزل گو شاعر تھے غزل گوئی میں طرب تخلص کرتے تھے۔منشی چھنو لال دلگیرؔ لکھنوی کے مراثی موسوم بہ ''مجموعہ مراثی مرزا دلگیر'' جلد اول ۱۸۸۸ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۳۰۶ھ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۔ اس میں 503 صفحات ہیں اس کے علاوہ دو جلدیں اور ہیں۔

چھنو لال دلگیرؔ کا کلام مستقبل کے متعلق ہے جو کہ امید افزاء خیالات کا اظہار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سدا شبنم کو اپنی چشم تر پر رشک آتا ہے
گل تر کو گل زخم جگر پر رشک آتا ہے
ہماری آہ نے ایسا اثر پیدا کیا ہے اب
دعائے خلق کو جس کے اثر پر رشک آتا ہے

رائے ٹیکا رام تسلیؔ۔رائے گوپال رائے سب سے چھوٹے بیٹے تھے تصنیفی استعداد کافی تھی ہندو اور فاسی زبان میں شعر کہتے تھے ان کی سات تصانیف کا حال معلوم ہے۔

''ان کی سات تصنیفوں کا حال کچھ یوں ہے ۔ دیواں فارسی،دیوان اردو،انشا کی دو کتابیں،فارسی نثر میں ایک قصہ،اردو نثر میں فارسی مثنویوں کا ایک انتخاب اور فارسی غزلوں کا ایک انتخاب اور آخری کتاب کا نام 'مجموعہ الشعراء' ہے''

(بحوالہ اردو شعروادب کے ارتقاء میں لکھنؤ کے چند شعرا کا حصہ)

مجموعہ الشعرا تسلیؔ کا بہت بڑا کارنامہ ہے سات فارسی دیوانوں سے ہم طرح غزلوں کے اشعار منتخب کیے ہیں۔اور دیوانوں کی صورت میں ترتیب دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ تو میری ہی جان ہے کافر
تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگنا ہے مرے تصور سے
کس قدر بد گمان ہے کافر
دن پھرے ہیں مگر تسلی کے
ان دنوں مہربان ہے کافر

جگن ناتھ سہائے خوشترؔ۔خوش تر کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ان کی ذہانت ومتانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کی بیشتر تصنیفات مذہبی ہیں۔

رامائن اردو،منظوم،کتھاست نرائن منظوم،سدا محیر ترعا اور شری مد باگوت اور مثنوی چتر گپت خاص مقام رکھتی ہیں۔خوشتر کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر اسرارالحق قریشی لکھتے ہیں۔

''آپ نے زیادہ تر اردو کلام چھوڑا،غزل بہت کہتے تھے۔خوشتر فن شعر میں کمال رکھتے

ہوئے بہت اچھے خطاط بھی تھے''

(بحوالہ اردو شعروادب کے ارتقاء میں لکھنؤ کے ہندو شعراء کا حصہ)

خواجہ عبدالرؤف عشرت نے اپنے تذکرہ میں غزل کے یہ دو شعر خوشتر کی طرف منسوب کئے ہیں:

ہم بلبل شیدا ہوں خوشی ہے تو یہ ہے
فصل گل آئی تمنائے دلی ہے تو یہ ہے
سروقمری گل وبلبل مئے ساغر ہیں بہم
دوڑ ساقی کہ دم بادہ کشی ہے تو یہ ہے

پنڈت دیا شنکر کول نسیمؔ۔ پنڈت دیا شنکر کول نسیم پنڈت تھے۔ بزرگوں کے وقت سے لکھنؤ کے باشندے تھے اردو فارسی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی علمی قابلیت کا صرف اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حافظ شیرازی اور بعض دیگر فارسی اساتذہ کی غزلیں تخمیس کی اور خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیمؔ
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

پنڈت دیا شنکر کی شاعری کا آغاز ان کی عمر کے بیسویں برس یعنی 1831ء میں ہوا تھا انہوں نے 32 برس کی عمر میں بعارضہ ہیضہ 1847ء میں انتقال فرمایا اور مثنوی گلزار نسیم 1838ء میں منظر عام پر آ گئی اس کے بعد صرف چار برس بقید حیات رہے تھے۔

گلزار نسیمؔ نہ صرف اپنے رنگ کی پہلی مثنوی ہے بلکہ اسے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی بھی کہنا بیجا نہ ہوگا اس مثنوی نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ہر طرف لوگوں کو مثنوی لکھنے کا شوق وحوصلہ پیدا ہوگیا۔

ابواللیث صدیقی کے الفاظ میں یہ خالص لکھنوی رنگ کی پیداوار ہے بلکہ دبستان شاعری کا مبادی نمونہ اس مثنوی کو قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مجموعی طور پر اس مثنوی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مثنوی گوئی کے فن کی بعض خامیوں کے باوجود خالص شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہ بلند پایہ نظم ہے اور لکھنوی شاعری کے اول درجے کے نمونوں میں بے تکلف شمار کی جاسکتی ہے۔ (لکھنؤ کی متبادل شاعر ص ۵۸۲)

دیوان دیا کرشن ریحان۔ ریحان کا شمار مسلم الثبوت اساتذہ میں ہوتا تھا۔ سلطنت اودھ کے زمانے میں ان کا خاندان بڑی عزت وشہرت رکھتا تھا اور واجد علی شاہ کے بڑے مداح تھے۔ ریحانؔ نے بڑے باکمالوں اور مشہور استادوں کی صحبت پائی تھی اور فن شعر کے رموز ودقائق پر پوری طرح عبور تھا معاملہ بندی کا مذاق بہت اچھا تھا۔ کلام نہایت پاکیزہ، صاف اور اکثر اشعار اخلاقی مضامین سے مملو ہیں۔ ریحان کا دیوان ان کی وفات کے بعد چھپا جس کا تاریخی نام ''باغ ریحان'' ہے۔ ریحان کے دیوان سے انتخاب پیش ہے:

سر زمیں آفاق کی ہے خاک ہائے لکھنؤ
کیجئے ہر ہفتہ کشور کو فدائے لکھنؤ
تازگی ہر بات میں ہے وضع میں انداز نو
ہے نرالی سارے عالم سے ادائے لکھنؤ

خیراتی لال شگفتہ۔ شگفتہ کے دیوان کی تفصیل دیوان لکھنؤ یونیورسٹی آف لکھنؤ ٹیگور لائبریری میں موجود ہے۔ یہ دیوان نسخۂ شنگرف 1315ھ کے نام سے منشی چاند بلی تکلم ساکن محلہ نویستہ چھپا۔ اس کے پہلے ہی صفحہ پر تلمیذ رشید مرزا نسیم دہلوی اور موجد سخندانی نکتہ سنج الفاظ معنی معجز بیاں فصیح زباں استاد کامل جناب منشی خیراتی لال صاحب متخلص بہ شگفتہ لکھنوی درج ہے۔ شگفتہ کے دیوان سے کلام پیش ہے۔

نہ شرماؤ آنکھیں ملاکر تو دیکھو
ملاقات ہے ہم سے تم سے کبھی کی
بخت ہے بیدار جیسے کاوش تقدیر کا
حوصلہ ہے خوب غفلت میں میری تدبیر کا
حسرتیں روتی ہیں مل مل کر گلے ہنگام قتل
زخم ہنستے ہیں مرے منہ چوم کر شمشیر کا

پنڈت رتن ناتھ شرشار۔ شرشار 1846ء کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے انگیزی ادب کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ مراسلہ کشمیر، اودھ پنچ، مراۃ الہنداور ریاض الاخبار میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ سرشار نے اپنی مشہور تصنیف فسانۂ آزاد دسمبر 1878ء سے بالا قساط دسمبر 1897ء تک اودھ اخبار میں شائع کی۔ بعدہ اسے 1298ھ مطابق 1880ء میں کتابی صورت میں ضخیم چار جلدوں میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں حیدرآباد سے شرشار نے دبدۂ آصفی نکالا۔

سرشار پہلے ادیب ہیں بعد میں شاعر۔ ان کی شاعری بھی ان کی مائے ناز تصنیف ''فسانۂ آزاد'' سے ہے۔ شاعری میں مظفر علی اسیر لکھنوی شوخی کے شاگرد تھے۔ مثنوی نظم، غزل اور قصیدہ میں طبع آزمائی کی۔ 21 جنوری 1903ء کو بمقام حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ شرشار کا کلام ملاحظہ فرمائیں:

ہر مرض کی دوا مقرر ہے
مرض عشق لا دوا دیکھا
گلستان عالم پہ چھائی گھٹا
وہ کوئی وہ کوئی وہ آئی گھٹا

اخیر میں چکبست کا قول نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

''اہل کشمیر میں دو صاحب ایسے گزرے ہیں جنکی شہرت کا دامن شہادت کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے ایک پنڈت دیا شنکر نسیمؔ دوسرے شرشار جنہوں نے حدیقہ نثر میں نئی روشنی دی''

(مضامین چکبست کے ایک مضمون سے)

محورؔ سلطان پوری: محور متخلص رکھتے ہیں مکمل نام لکھپت رائے سکسینہ ہے۔ محور سلطانپوری کے تین شعری مجموعے ''فردوس گم شدہ''، شعلہ شراب، شباب اور پرتولتی خلائیں ان کی حیات میں ہی منظر عام پر آ چکے

ہیں اور پروفیسر آل احمد سرور اور شمیم حنفی روح روانِ ادب اردو کے ہاتھوں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

آل احمد سرور فردوسِ گمشدہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اچھا چلو یوں ہی سہی'' کیا نشیمن کیا قفس''

کلیسہ، بت کدہ کعبہ اے دیدۂ نم اے دیدۂ نم اور مرحبا آفرین جیسی ردیفوں والی غزلیں ان کی قادرالکلامی کا پتہ دیتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی غزلیں تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ ان میں اردو تہذیب کی دلآویزی اور جمال بھی ہے بالخصوص متصوفانہ آہنگ کی طہارت اور جلال بھی ان کی غزلوں سے پتہ چلتا ہے کہ محور صاحب اردو غزل کے کلاسیکی روایتوں کے شناسا ہی نہیں ان کے عارف اور امین بھی ہیں۔''

اسی طرح شمیم حنفی ''یاد آتی ہیں پرانی باتیں'' کے عنوان سے محور صاحب کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یوں تو محورؔ صاحب نے عشقیہ شعر بھی کہے اور رسمی مضامین بھی باندھے لیکن صرف انہیں پر تکیہ نہیں کیا زبان پر انہیں دسترس حاصل ہے مشکل زمینوں میں بھی وہ شعر نکال لیتے ہیں اور صنعتوں کے برتنے میں بھی قادر ہیں شاعری ان کا جذباتی مشغلہ بھی ہے اور فکری مشغلہ بھی۔ چنانچہ عمومی طور پر ان کے کلام میں فکر کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ ''فردوسِ گمشدہ'' مجموعے میں رسمی شاعری تو ملے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اظہار کے اس منظر نامے پر ایسی تصویریں ونقوش بھی سامنے ملیں گے جس کی نوعیت، ہیئت اور ماہیت سب میں انفرادیت کی آنچ محسوس ہوگی۔''

محور صاحب کے کلام کے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کبھی دیوانگی سمٹی غزل بن کر بہ مجبوری
کبھی رسوائیاں پھیلیں بہ طرزِ داستاں قصداً

.....

گل تر شکوہ جور فلک کرتے ہیں کیوں گلچیں
زبانِ خار نے کہہ دی چمن کی داستاں جیسے

یوں تو ہر بحر میں ہے خوف تلاطم محور
یہ زمیں بھی نہیں ہموار مگر تم کو کیا

وفائے محبت اسی سے ہے قائم
غمِ دو جہاں کی حفاظت کریں گے

.....

آؤ اے دیوانوں مل کر وحشتِ غم کے صدقے میں
جنت میں بھی پیدا کر دیں ایک بیاباں کم سے کم

.....

اے ذوق نظر کاٹ دے آنکھوں میں شبِ ہجر
ہیں داغ جو دل میں تو ستارے بھی بہت ہیں

تمنا جستجو دیوانہ پن کیا کیا نہیں ہوتا
وفا کی راہ میں اے راہِ زن کیا نہیں ہوتا

.....

تمام عالم ہستی ہے بت کدہ محور
برائے سجدۂ حق جائے سرنگوں بھی ابھی

لکھنؤ کے غیر مسلم شعراء میں محض چند اساتذہ کے حالات وکلام کا اتنا مختصر اور مجمل تجزیہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اردو زبان کی اصلاح وترقی اور شاعری کو نکھارنے اور اس کا معیار بلند کرنے میں انکا حصہ مسلمان ادیبوں وفنکاروں کے مقابلہ میں کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ غیر مسلم شعرا کی ایک تعداد ایسی بھی تھی جو کہ درباریوں سے وابستہ نہیں تھی پھر بھی برادران ہنود کو زبان اردو سے شغف کم نہیں تھا وہ اردو کو ترقی دینے کے خواہاں تھے جس کی بدولت یقینی طور سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان ہندوؤں اور اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ آخری دور کے شعرا: میں وشنو کمار شوقؔ، کرشن بہاری نورؔ اور بسنت کمار بسنتؔ ایسے شعراء تھے جنہوں نے اردو شاعری کو عروج پہ پہونچایا اور جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ آج بھی لکھنؤ میں کچھ ایسے نام ہیں جو اچھی اردو شاعری کر رہے ہیں مثلاً رام پرکاش بیخودؔ، سنجے مشر اشوقؔ، منیش شکلا وغیرہ۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی تمام اصناف میں ہندو شعراء نے خوب طبع آزمائی کی اور اردو شعروادب کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کرنے میں ذرہ برابر تساہلی نہیں کی۔ یہی ان کی اردو دوستی واردو نوازی کا عین ثبوت ہے۔

❑❑❑

نقوش ایام

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'نقوش ایام نمبر' بھی شامل ہے۔ ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اسکی قیمت ۲۰۰/ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۳۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔ ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

ڈاکٹر کہکشاں خاتون
A-129، کرشچین کالونی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
رابطہ: 9415284215

علامہ اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر

لفظ قوم انگریزی لفظ Nation کے مترادف ہے۔ یہ لفظ ایک بڑی حد تک غیر متعینہ معنوں میں کبھی ایک مذہب یا ذات، کبھی ایک علاقہ کے رہنے والے یا کبھی ایک سیاسی انتظامیہ کے تحت زندگی گذارنے والے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر قوم لفظ کے کوئی معنیٰ متعین نہیں ہیں۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ۔ اس کے مفہوم کے تصور میں قوم کو ایک خطہ ارض یا مملکت کے رہنے، بسنے والوں کو سمجھا جانے لگا۔

قومیت کا تصور کب اور کس زمانے میں پیدا ہوا اس بارے میں جے پرکاش نرائن کا خیال ہے:

''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قومیت کا وہ شعور جو دور حاضر میں ہے کب پیدا ہوا لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں اس کی نشاندہی کرنا غلط نہ ہوگا۔''

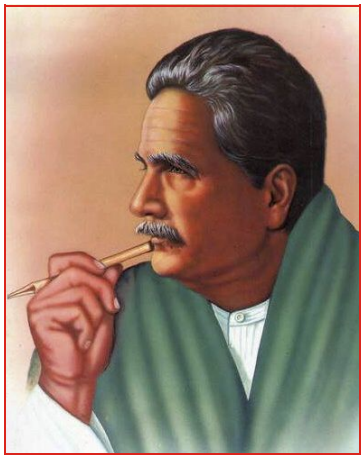

لیکن عہد حاضر میں قومیت کا تصور ان معنیٰ میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ جو عہد قدیم میں تھا۔ چینی یا مسلمان جو ہندوستان آئے وہ اپنی مخصوص تہذیبیں لے کر آئے تھے۔ اس وقت ان کے خیال میں بھی قومیت کا وہ تصور جو آج ہے وہ نہیں تھا۔ یہ تصور یا قانون کی بنیاد پر ہوگا یا سماجی بنیاد پر، قانون کی بنیاد پر قومیت کے معنیٰ یہ ہوئے کہ وہ حکومت جس کو اس کے شہری تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے وہ علاقہ جس میں لوگ زندگی گذارتے ہیں۔ قوم یا قومیت کے تصور دوش بدوش ایک اور نہایت پیچیدہ تصور بھی سامنے آتا ہے۔ جس کے لیے لفظ کلچر Culture استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے بنیادی اجزا نسل، مذہب، جغرافیائی حد بندی اور اقتصادی ضروریات سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کلچر کا جزو تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی جز و کلچر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ نسل پر کلچر کی جو لوگ بنیاد سمجھتے ہیں اس کی عملی شکل میں تردید دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہوگئی ہے۔ جب یہ بات پوری طرح واضح اور کھل کر سامنے آئی ہے کہ نسلی فرق یا نسلی کلچر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عام مشاہدہ ہے کہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہیں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بدلے ہوئے ہیں۔ ان کی کسی طرح کی ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نسل کی بنیاد، رنگ اور جسم کی ساخت پر ہوتی ہے۔ اور یہ تمام باتیں جغرافیائی حالات پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور جب کسی ایک خطہ سے یہ نسل دوسری جگہ پہنچی تو اس تبدیلی زبان اور مکان نے مختلف خطہ ارض کے بسنے والے افراد کے باہمی میل جول نے نسلی امتیازات بڑی حد تک مٹا دیئے۔

اس طرح نسلی کلچر کا مفہوم ہی ختم ہوگیا۔ کچھ لوگ مذہب کو کلچر کا رہین منت مانتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہب بڑی حد تک کلچر کا جزو ہے۔ لیکن جب تک مذہب وعقیدہ شخصی واردات قلب اور شعور کا نتیجہ ہے اور وہ کیفیت ہے جو دل پر گذرتی ہے۔ اس وقت کلچر کی بنیاد مذہب پر استوار نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کلچر اجتماعی شعور کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں ہزاروں افراد نے عیسائی مذہب اختیار کیا لیکن کلچر کے اعتبار سے وہ انگلستان کے عیسائیوں سے بالکل الگ ہی رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر عرب اور امریکہ کے مسلمانوں سے بالکل مختلف ہے۔

سید مجاور حسین نے کلچر کے لیے جن ترکیبی عناصر کو واضح کرتے ہوئے کلچر کی تعریف کی وہ اس طرح ہے۔

۱۔ کلچر انسانی جماعت کے لیے ہوگا۔

۲۔ کلچر کا رشتہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے ہوتا ہے۔

۳۔ اس کا تعلق تصورات سے ہوگا۔ جس کے مظاہر تہذیب اور تمدن کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ (شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ تہذیب کے بغیر کلچر کا وجود ممکن نہیں ہے۔ لیکن ایسے تہذیبی آثار کا وجود ممکن ہے۔ جس کا کوئی کلچر نہ ہو)

۴۔ کلچر کا کوئی جامہ تصور نہیں ہوتا بلکہ حرکی ہوتا ہے اور عمل اور ردعمل کی صورت میں اپنے مظاہر کو واضح کرتا ہے۔ اس تشریح کے پیش نظر کلچر کی تعریف ہوگی۔ ''کلچر انسان کی ان تخلیقی کاوشوں کو کہیں گے، جو نظام حیات کی ترتیب، تنظیم اور تہذیب کرتی ہیں اور جس کے اثرات ارتقائی طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

اس ساری بحث کا نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یکجہتی اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ یہ مکمل بیک وقت مختلف قومیتوں میں تقسیم نظر آتا ہے، پھر بھی ایک متحدہ قوم بن کر ابھرتا ہے۔ اس حقیقت کی تشریح یوں ہوتی ہے کہ اگر جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد قدیم میں چار حصوں میں ہندوستان بٹا ہوا تھا لیکن جغرافیائی اعتبار سے ایک سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہمیشہ سے ملک کے ایک خطہ سے دوسرے خطہ تک جانے کی سہولیت تھی نہ ناقابل عبور پہاڑی کا سلسلہ نہ ایسا کوئی سمندر یا جنگل جس سے گزرنا ناممکن ہو، ساتھ ہی مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبی سرمایوں سے مالا مال اس جغرافیائی فضا اور اس میں رہنے والے اور بسنے والے ہمیشہ سے ایک سرزمین پر رہتے بستے چلے آتے ہیں۔ ان کے دکھ درد، خوشی ومسرت ان کے نظام سے پیدا ہونے والے طریقے، ان کے رہن سہن سب کم وبیش مشترک رہتے ہیں اور یہ اشتراک کوئی خدائی حکم یا حادثہ نہیں جو اچانک سامنے آگیا ہو بلکہ اس جغرافیائی سانچے میں ڈھل کر اس طرح سامنے آیا کہ اس نے ہندوستان کو وحدت یا شعور یکجہتی عطا کی ہے۔

اسلام کا آغاز بانی اسلام کی پیدائش ۵۷۱ھ کے چالیس سال بعد ۶۱۰ میں ہوا۔ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں یہ گذشتہ مذاہب کی تصدیق کرنے کے ساتھ ان مذاہب کے اچھے اصولوں کو باضابطہ طور پر پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک مبسوط نظام زندگی ہے۔ جس کے دائرہ کار میں زندگی کے سبھی گوشے آتے ہیں۔ یہ سماج میں ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جس میں فرد جماعت سے جڑا رہے۔ اپنی شخصیت کے مدارج بھی مکمل اور پورے کرے۔ اس طرح اسے ہم حقوق اور فرائض ادا کرنے کا نام دے سکتے ہیں۔ جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اللہ کا حق: یعنی بندے پر خدا کی طرف سے عائد کیے گئے حقوق۔

حق العباد: بندوں پر بندوں کے حقوق۔

حق النفس: یعنی ایک فرد پر خود اس کے اپنے حقوق۔

ہر بندہ اپنے افعال میں آزاد ہے، جیسا عمل کرے ویسی سزا وجزا کا وہ مستحق ہے۔ دنیا دار العمل ہے اور ان کے اعمال کی پوچھ گچھ مرنے کے بعد ہوگی۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جنہوں نے اللہ کا حق ادا نہیں کیا ان کو سزا دینے یا معاف کردینے کا اختیار اللہ کو ہوگا۔ اور جنہوں نے بندوں کا حق ادا نہیں کیا، اس سلسلے میں اسلام میں خاصی سختی ہے انسانوں کو آپسی رشتے مضبوط کرنے کے لیے جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ انہیں ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں سزا کا موجب ہوگا۔ دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی دباؤ نہیں، تعظیم کا مستحق وہی ہے جس کے اعمال اچھے ہیں۔ یعنی دولت، علم، عزت وشہرت یہ انسانی زندگی کا معیار نہیں۔ زندگی میں صرف نیک عمل ہی سب کچھ ہیں۔ عربوں نے ایران پر فتح کرنے کے بعد سمندر کے ذریعہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کا بھی رخ کیا اور دکھنی ہندوستان میں آبادیاں قائم کیں۔ اس طرح عربوں کے اثرات ہندوستانی تہذیب پر پڑنے لگے او رہندوستانی تہذیب کے اثرات مسلمانوں پر۔

ہندوستان کے خمیر میں مذہبی رواداری کا جذبہ تھا۔ عرب مہمان نوازی کو اپنے کلچر کا جزو سمجھتے ہیں۔ مہمان نوازی ہندو مذہب کا جزو اعظم تھا۔ اس لئے جنوبی ہند میں آنے والے مسلمانوں کا استقبال ایک مہمان کی طرح ہوا اور وہ ہندوستان کے تہذیبی دھارے میں اس طرح گھل مل گئے جیسے دو ندیوں کا پانی ایک ہوجاتا ہے۔

مذہبی اعتبار سے آپسی اختلاف بھی ہندوستان کے روادارانہ مزاج سے ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جو باہم مشترک تھیں۔ مثال کے طور پر

۱۔ ہندو مذہب میں دیوتاؤں اور اوتاروں کا تصور تھا۔ مسلمانوں کے یہاں رسول پیغمبر اور فرشتے کا تصور تھا۔ پیغمبر اوتار تو نہیں تھے۔ لیکن خدا کے

بھیجے ہوئے ہوتے تھے۔فرشتے ہر کام کے لیے الگ تھے، اسرافیل، عزرائیل، میکائیل، جبرئیل، کوئی موت کا فرشتہ تو کوئی داروغۂ جنت، ہندوؤں کے یہاں بھی موت، جنت، دوزخ، بارش، آگ، پانی اور ہوا وغیرہ غرضکہ ہر کام کے لیے الگ الگ دیوتا تھے۔ ویدک مذہب میں خدا کی وحدانیت کا تصور تھا۔ وہ قادرِ مطلق تھا اسلام بھی خدا کی وحدانیت کا موئید ہے۔

۲۔ دونوں مذہبوں میں خود کو خدا کی رضا کا پابند بنالینا ضروری تھا۔ اور یہی انسانیت کی معراج سمجھی جاتی تھی۔

۳۔ دونوں مذہبوں میں کرم یا عمل کا تصور ایک تھا۔ دونوں مذاہب میں خالق سے محبت اور بھکتی کے لیے وسیلے کی شرط تھی۔

۴۔ دونوں مذہبوں میں عبادت کے آداب تھے، عبادت گاہ کا تصور تھا۔ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا یا تیرتھ استھان کے لیے یاترا کرنا ضروری تھا۔

۵۔ دونوں مذاہب میں برت یا روزہ کا تصور عام تھا اور عبادت کا خاص وقت صبح اور شام تھا۔ مسلمانوں کے یہاں عبادت کے لیے بلانے کے لیے اذان ہوتی اور ہندوؤں کے یہاں گھنٹہ بجانے کا رواج تھا۔

۶۔ دونوں مذہبوں میں قربانی بھینٹ یا بلیدان کا تصور تھا۔ پرانے ویدک دھرم میں یہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ اور کم ہوکر یہ رواج صرف کالی پوجا کے موقع پر رہ گیا اور مسلمانوں کے صرف بقرعید کے موقع پر ہے۔

۷۔ ہندو اور مسلمان مذاہب دونوں معاشرے کی درستگی اور اصلاح کے مبلغ تھے۔

۸۔ دونوں مذاہب میں زبان کی تعدیس اور اہمیت پر زور دیا گیا۔ قرآن شریف صرف عربی زبان میں پڑھنا واجب ہے۔ ہندوؤں کے یہاں وید مقدس، گیتا اپنشد، رامائن کی زبان سنسکرت تھی، اسی زبان میں اشلوک اور منتر کا پاٹھ ضروری ہے۔

۹۔ دونوں مذاہب میں زندگی کے عملی پہلو پر زور دیا گیا اسی لیے دونوں مذہبوں میں ایسے لوگوں کے کارنامے ملتے ہیں جو اپنے کردار و عمل کے اعتبار سے خلائق کے لیے نمونہ ہے۔ ان میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں۔ اخلاقیات کے اصول مثلاً مہر و وفا، شجاعت وسخاوت، فیاضی اور دکھ ومصائب میں ثابت قدمی دونوں مذاہب کی تعلیم ہے اور مذہب کی بقا کی خاطر جان دینا وغیرہ دونوں مذاہب میں شامل ہیں۔

۱۰۔ دونوں مذہبوں نے مذہبی فرائض کی ادائیگی کا اجتماعی شعور بھی رکھا اور ایسے موقعوں پر اپنی عبادات کو تقرب کی شکل میں انجام دینے کی تلقین کی۔ ہندوستان میں دسہرہ، ہولی، دیوالی، رکشابندھن وغیرہ کے تیوہار تھے اور مسلمانوں کے یہاں عید، بقرعید اور محرم اور عید روزوں کی تکمیل کے بعد منائی جانے والی خوشی ہے۔ ہندوؤں کے یہاں ہولی، دیوالی وغیرہ تیوہار اسی طرح کے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے یہاں مذہبی تقریبات اور پیدائش اور موت کے موقعوں پر کھلانے کا دستور ہے۔ اجتماعیت کا یہ تصور اور منائے جانے کے انداز نے بہت سے رسوم وضوع کر لیے تھے۔ دونوں مذہبوں میں سچائی کی راہ پر جان دینے والے کے درجات بلند بنائے گئے ہیں۔ ہندو مذہب کی رو سے اللہ نے سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا اور اسلام کی رو سے پروردگار عالم نے سب سے پہلے پانی کو پیدا کیا۔ دونوں مذاہب میں علم کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ شیطان سے ملتا ہوا تصور ہندوؤں کے یہاں (Asur) یا (Rakshas) ہے جو خدائی نظام کے لیے خدشہ یا خطرناک بتایا گیا ہے۔

یہ تمام مماثلتیں مذہب کے اصول اور بنیاد پر تحریر کی گئی ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان کے باطنی احساسات سے ہوتا ہے۔ اس کا اصل مقصد پاکیزگی نفس ہے۔ ہندوستان کے دوسرے مذاہب میں بھی یہ باتیں کسی نہ کسی شکل میں نظر آسکتی ہیں۔ سیاست اور معاشرت اور بڑا بننے کی ہوس جن نفرتوں کو ہوا دیتی ہے۔ مذہب، اخلاق اور روحانیت انہیں کم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ اور جب سیاست میں مقاصد کا اتحاد ایک ہی راہ پر چلنے پر زور دیتا ہے تو دوریاں اور فاصلے کم ہوجاتے ہیں۔ دونوں مذاہب کی تعلیمات میں جزوی اختلاف تو ہوسکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر سب کے نظریات ایک ہیں اور سب ہی مسلک یعنی خدائے واحد جو اصل حقیقت ہے، پر منتخب ہوئے ہیں۔ ذات پات کی تفریق کے خلاف بغاوت اور ہر مذاہب کا احترام اور تمام انسانوں سے محبت کے جذبات کو پیدا کرتا ہے۔ اور نفرت کی بیخ کنی کرتا ہے۔

سیاسی بنیادوں پر ہندوستان کے نین گوشوں میں اختلاف کے وہ رجحانات پیدا ہوئے، جن کا تعلق شاہ جہاں کے دور حکومت سے ہے۔ جب یہ طاقتیں جو قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کے علمبرداروں کی زبردست طاقتوں کے سامنے کچھ نہیں تھیں۔ بدیسی حکومت کی شہ پاکر ابھر کر سامنے آگئیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دامن پر۔ فرقہ واریت کی چنگاریاں پڑ چکی تھیں۔ جو ہماری قومی تہذیب کے جامہ کو خاکستر کررہی تھیں۔ دوسری طرف طاعون، قحط، غربت وتنگ دستی، بھوک مری اور بدیسی راج کا قہر تھا۔ برٹش راج ہندوستان کی عزت وحمیت کو پارہ پارہ کررہا تھا اور طرفہ تر یہ کہ فرقہ واریت کا عفریت ڈسنے پر تلا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ متوسط طبقہ نے جدید خیالات کو اپنالیا تھا۔ اور ان کے اندر

تنقیدحیات کا شعور پیدا ہوچلا تھا۔ یہ طبقہ ارتقا جمہوریت اور غیر مذہبی اور قوم پرستانہ بنیادوں پر استوار تھا۔ اس کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اس طبقہ نے برٹش حکومت کے اس چیلنج کو قبول کرلیا تھا۔ اس زمانے میں دادا بھائی نوروجی نے اتحاد اور سوراج کا نعرہ بلند کیا۔ برٹش راج کے چیلنج کو قبول کرنے والے متوسط طبقے میں وہ افراد بھی تھے۔ جن کا تعلق اردو شاعری سے تھا۔ ان میں سرور جہاں آبادی، اقبالؔ، چکبستؔ، شبلیؔ، اکبرالہ آبادی خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کے شعور کو جدید علوم کی روشنی میں قائم اور مضبوط کرنا۔ اس زمانے میں قومی یکجہتی کا یہی تصور تھا۔

۱۔ حب وطن کا صحیح شعور پیدا کیا جائے۔
۲۔ فرقہ واریت کو ختم کردیا جائے۔
۳۔ ہندوستانیوں میں جذبہ آزادی کو عام کیا جائے اس آزادی کا مفہوم صرف سیاسی سطح پر نہ استوار ہو بلکہ تہذیبی سطح پر بھی اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں اپنی تہذیب کو علامت بنا کر عام کیا جائے گا۔

اس مقدس فریضہ کو اردو شاعری نے شاندار طریقہ پر انجام دیا اور قومی یکجہتی کے چراغوں کو روشن کرکے ہندوستان کو نئی روشنی عطا کی۔

اقبالؔ بخوبی واقف تھے کہ سامراجی قوتیں ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے نظریے پر قائم رہ کر زندہ رہتی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اہل وطن کو باور کراتے ہیں کہ ملک میں مختلف فرقوں میں موجود اور دن بہ دن بڑھتے ہوئے جھگڑے، سامراجی طاقتوں کو طاقتور بنا رہے ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھا کر سامراجی ہمارے ملک پر اپنا تسلط جمائے ہوئے مزے کررہے ہیں۔ تصویر درد ایک طویل نظم ہے اس مین وہ ایسی تکالیف کا ذکر کرتے ہیں جس سے ہماری قوم جوجھ رہی تھی اور ان اسباب اور وجوہات کو بھی نمایاں کرتے ہیں جو قومی یکجہتی کی شاہراہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ تصویر درد کے شروعاتی اشعار ہی اقبال کی آواز کی کسک ہے۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی سے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

.....

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

.....

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

.....

میرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اقبال چاہتے تھے کہ ہم خودشناس ہوں اور اپنے دکھوں کا مداوا خود ہی تلاش کریں۔ اور اپنے زخموں پر مرہم خود ہی رکھیں اور یہ مرہم قومی اتحاد اور باہمی محبت، اخوت اور یگانگت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشم پرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رلواتا ہے آدم کو
ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو

.....

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

.....

پھرا کرتے ہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہی زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

اقبالؔ اس حقیقت پر اشک افشانی کرتے ہیں کہ ہندوستانی قوم کی قسمت کے مالک ومختار اغیار ہوگئے ہیں۔ اور قوم بے حس وحرکت ہے۔ اسے عزت نفس کا ذرا پاس ولحاظ نہیں۔ ایک طرف سامراجی حکومت کی غلامی اور دوسری طرف اتحاد قومی اور اتفاق کا فقدان ہے۔ ہمارے ذہنوں میں پرورش پا رہا یہی امتیاز من وتو یعنی فرقہ پرستی، غلامی کا اولین سبب ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل وطن غیریت قومی پیدا کریں۔ اور ایسا مستغنیٰ قلب مطمئنہ حاصل کریں کہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں لیکن اپنوں کے شریک درد والم رہیں۔ تو ہم میں بیداری پیدا ہوگی۔ جو ہمارے بخت خفتہ کو بیدار کرکے ہماری تقدیر بدل دیگی۔

شراب بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکست رنگ سے سیکھا میں نے بن کے بور ہنا

.....

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبالؔ کی شاعری کا دوسرا دور کہا جاسکتا ہے۔ یہی زمانہ ان کے قیام یورپ کا بھی زمانہ تھا۔ وہاں انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہاں حب الوطنی کی لے اور حدود سے باہر نکل کر جارحیت اور جنگجوئی میں بدل گئی تھی۔ خودمختار، طاقتور اور قومی ریاستیں یورپ میں ابھریں۔ پھر رفتہ رفتہ ہوس اقتدار کمزور اور نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے لیے ان میں آپس میں سخت دشمنی پیدا ہوئی۔ اور طاقتوروں میں یہ جذبہ ابھرا کہ کمزوروں کو محکوم بنالیں۔ اقبالؔ نے یہ سب کچھ نہایت دور بینی سے مشاہدہ کیا۔ اور اس تاریخی عمل کا تجزیہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قوم پرستی کا محدود نظریہ مختلف ملکوں میں اس جنگجوئی اور تصادم کا ذمہ دار ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال آنے والے واقعات اپنے حساس اور بیدار ذہن سے بخوبی دیکھ لیتے تھے۔

مجھے راز دوعالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

.....

حادثہ جو کہ ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

ان محسوسات اور مشاہدات نے اقبالؔ کے نظریہ قوم پرستی میں تبدیلی پیدا کی کہ وہ ایسے نظام کے متلاشی ہوئے جو بلند شریفانہ اقدار پر مبنی ہو۔ اور انہوں نے سوچا کہ جذبۂ حب الوطنی کو اگر بلند مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تو یہ کمزور قوموں کے استحصال کا موجب بھی ہوسکتا ہے وطنی الفت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی مذہبی وراثت میں بھی قلبی لگاؤ رکھا۔اسی عظیم تصور نے ان سے یہ ملی ترانی کہلوایا:

چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

.....

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

.....

خیرہ نہ کرسکے مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ ونجف

ایسے اشعار کی بنا پر بعض لوگ اس اعتراض پر اتر آئے کہ اسلام ہی اقبال کی شاعری کا محور ہے اور یہ کہ ان کے جذبۂ حب الوطنی پر اسلام دوستی غالب آ گئی لیکن شاید وہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ اقبال کے عقیدہ اور ان کے اعمال کی پاسداری میں کس جگہ یہ اشارہ نہیں ملتا کہ وہ کبھی حب وطن سے بے نیاز رہے ہوں۔اسی طرح اقبالؔ کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ نظریہ پاکستان کے خالق تھے۔اس مفروضہ کے رد کی خاطر ڈاکٹر تاراچند کا یہ اقتباس من وعن پیش ہے۔

''The partition of Indian was not the product of the fertile imagination of Muslim undar graduates of Combridge University not even poet Iqbal's fancy but the brain chiled of a hyper sensitive Hindu Stalwart''.

اسی طرح ڈاکٹر راجیندر پرساد نے اقبال کے تصورات ونظریات کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؔ کے ۳۰/اپریل ۱۹۲۶ء کے پٹنہ میں دیئے گئے بیان کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔

''اقبال نے کہا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ شمال کی جانب سے نظریاتی فوجی حملے کا دفاع نہیں کریں گے اور ملک سے غداری کریں گے۔بڑی غلط بات ہے۔یہی حملہ کوئی مسلمان یا غیر مسلم کرے پورے ہندوستان کو متحد ہوکر اس کا دفاع کرنا چاہئے۔''

ان معتبر اقتباس کی روشنی میں اقبالؔ کو قومی یکجہتی کا مخالف گرداننا یا علیحدگی پسند ٹھہرانا درست نہیں ہے۔ اقبال نے آخری ایام تک خود کو مسلم ہندی ہونے کا نہ صرف یہ کہ اعلان کیا بلکہ فخر بھی کیا اور ملکی تحریکات میں قومی یکجہتی کے تصورات کو جگہ جگہ اجاگر کرنے کی کوشش کی اور تحریک آزادی کی اپنے مفکرانہ انداز میں تائید بھی کرتے رہے اور اس تحریک سے اپنے کو ہم آہنگ رکھا۔انہوں نے غلامی کو اسیری سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے لوازم سے بھی آگاہ کیا۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زنداں قفس سے ارجمند

چنانچہ انہوں نے ہندی مسلمانوں کو ہندو مسلم یا کعبہ ودیر کی تفریق کو بھلا کر ان کے محدود تصور اور دائرہ فکر سے باہر آکر پورے ہندوستان کو اپنی فکر کا محور بناتے ہوئے۔۱۹۳۵ء میں یہ کہا تھا۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

ان کا یہ بھی نعرہ تھا:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخ امراء کے درودیوار ہلادو

.....

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

اقبال کی قومی یکجہتی کے سلسلے میں ان کی نظم ''شعاعِ امید'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

.....

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اس دانائے راز کو اردو شاعری اور مشترکہ تہذیب کے علمبرداروں نے اس لیے سراہا کہ کم سے کم اقبال کے بارے میں نہ وہ کوتاہ بیں تھے اور نہ غلط فہمی کا شکار۔سر تیج بہادر سپرو نے عبدالحق کے نام اپنے ایک خط میں اقبالؔ کے بارے میں صاف صاف لکھا:

''یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا لیکن کسی نے آج تک ملٹن Milton کو یہ کہہ کر صرف نظر نہیں کیا کہ وہ عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ کالیداس کے بارے میں یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا۔اس کے اثر کو محدود نہیں کیا۔اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں۔''

اقبال کی حیات اور شاعری کا اگر سنجیدگی سے جائزہ لیں تو یہ بات بخوبی واضح ہوسکتی ہے کہ اقبال ہمیشہ سے یگانگت، آپسی میل ملاپ اور مذہبی رواداری کے قائل تھے۔ اقبالؔ کے دوستوں میں اوائل عمری سے ہی دونوں خیالات کے ماننے والے شامل رہے۔اس زمانے میں انہوں نے جو شاعری کی اس کا خاص موضوع اتحاد اور یگانگت تھا وہ ملک میں آپسی میل جول اور اخوت کے خواہاں تھے اس لیے ہر مذہب کی قدر کرتے تھے۔اقبالؔ کے طالب علمی کے زمانے کی شاعری میں بھی اتفاق میل ملاپ اور اتحاد کی صاف وشفاف تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

❑❑❑

محمد نہال افروز
شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (تلنگانہ)
رابطہ: 9232815440

حسین خواب

''پیپ پیپ پی.....پی، پیپ پیپ پی.....پی.....''

''چلو.....چلو.....جلدی چلو، باہر گاڑی ریڈی ہے اور ڈرائیور لگاتار ہارن بجائے جارہا ہے۔'' میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ دومنٹ میں آرہے ہیں۔'' میں نے باہر نکل کر ڈرائیور کو آواز دی۔

''چلو.....چلو.....ہم سب تیار ہیں۔'' دوستوں نے ایک جٹ ہوکر پیچھے سے آواز دی۔

''ہاں ہاں.....چلو چلو۔'' ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھائی۔ کچھ ہی پلوں میں گاڑی رفتار پکڑ لی۔ گاڑی ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ تیزی سے گزر رہی ہے۔ دور دور تک چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آرہی ہے۔ جدھر بھی نظر اٹھا کر دیکھتے کھیت ہی کھیت نظر آرہے ہیں۔ کھیتوں میں طرح طرح کی فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ ان میں زیادہ تر گنّا، گیہوں اور سرسوں کی فصلیں ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ ہم لوگ باہر کا منظر دیکھتے دیکھتے تھک گئے تو گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کرکے آرام کرنے لگے۔ گاڑی ہوا کی رفتار سے آگے بڑھتی جارہی ہے۔ اچانک سرسوں کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ناک میں پہنچی تو میری آنکھیں کھل گئیں اور میں باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر کھیتوں کا منظر بہت ہی خوبصورت لگا۔ زیادہ تر کھیتوں میں گیہوں اور سرسوں دونوں ایک ساتھ بوئے گئے ہیں۔ گیہوں کے پودے ابھی چھوٹے ہی ہیں، لیکن سرسوں کے پودے کافی بڑے ہو چکے ہیں اور ان میں اچھی طرح سے پھول بھی آچکے ہیں۔

باہر کھیتوں کا منظر ایسا لگ رہا ہے جیسے سبز رنگ کی چادر پر پیلے رنگ کے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ دور دور تک پیلا رنگ ہی نظر آرہا ہے۔ ان پھولوں پر شام کی پیلی پیلی سورج کی کرنیں پڑ رہی ہیں، جس کی وجہ سے یہ منظر اور بھی زیادہ خوبصورت نظر آرہا ہے۔ اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر میں نے کہا ''نور، ساجد، رحیم دیکھو دیکھو یہ کھیت کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔''

''کون سا کھیت؟'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''ارے بابا.....تم لوگ باہر دیکھو تو سہی۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

باہر دیکھتے ہی سب کے سب حیران رہ گئے۔ ایسا خوبصورت اور دل نشین منظر ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''کتنا خوبصورت نظارہ ہے یار۔'' رحیم نے فوراً کہا۔

''تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' ساجد نے اس منظر کو دیکھنے میں دلچسپی دکھائی۔

''گاڑی تھوڑی دھیمی کیجیے۔ یہ تو واقعی دیکھنے لائق ہے۔'' نور نے ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ اب گاڑی سست رفتار سے چل رہی ہے تو کھیت اور بھی خوبصورت اور دلکش نظر آ رہے ہیں۔

ہم لوگ گاڑی سے نیچے اترے اور باری باری سرسوں کے پھولوں کے بیچ جا کر تصویریں نکالنے لگے۔ تصویر کھینچ ہی رہے تھے کہ اچانک اسکول کی گھنٹی بجی اور ہم لوگ دوڑتے ہوئے کلاس روم میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹیچر آئے اور ایک کے بعد ایک سب کا ہوم ورک چیک کرنے لگے۔ اتنے میں ساجد نے ٹیچر کو یاد دلایا کہ آپ نے سب سے نظم سننے کے لیے بولا تھا۔ ٹیچر باری باری سب سے الگ الگ ایک نظم سننے لگے۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے حفیظ جالندھری کی نظم ''لو پھر بسنت آئی'' سنائی۔

''لو پھر بسنت آئی
پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لبِ آبِ گنگ
بجے جل ترنگ
من پر اُمنگ چھائی
پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی
پھر ہو گیا ہے زندہ
باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ
پھولی ہوئی ہے سرسوں
پھولوں پہ رنگ لائی
لو پھر بسنت آئی''

سارے بچوں سے نظم سننے کے بعد سر نے ایک نیا سبق پڑھایا اور اگلے دن کا ہوم ورک دے کر چھٹی دے دی۔ چھٹی ہوتے ہی لوگ ہم پھر اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھائی۔ گاڑی ایک بار پھر دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی۔ اب رات ہو چلی ہے۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ گاڑی کے باہر سوائے سامنے کی سڑک کے کچھ اور نظر نہیں آ رہا ہے۔ گاڑی کی رفتار لگاتار بڑھتی جا رہی ہے۔ اچانک دور ایک گھر دکھائی دیا۔ اس پر طرح طرح کے لائٹس لگے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بہت خوبصورت نظر آ رہا ہے۔ ہم لوگوں نے کہا چلو دیکھتے ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ یہاں ہمارا ایک کلاس میٹ ریحان موجود ہے۔ ریحان کو دیکھ کر ہم لوگ تذبذب میں پڑ گئے۔

''ریحان تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ہم لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔

''یہ میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہتا ہوں۔'' ریحان نے جواب دیا۔

اچھا تمہارے یہاں کوئی فنکشن ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! آج میرے بھائی کی شادی ہے۔ چلو تم لوگوں کو اپنے گھر والوں سے ملواتا ہوں۔'' کہتے ہوئے ریحان ہم لوگوں کو اندر لے گیا۔

ہم لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ وہاں بہت بھیڑ ہے۔ اس بھیڑ میں میرے سارے دوست گم ہو گئے۔ میں انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کبھی انہیں گھر کے اندر تلاش کر رہا ہوں، کبھی باہر ڈھونڈ رہا ہوں اور کبھی گاڑی میں جا کر دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ لوگ کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ بلکہ میں نے دیکھا کہ ان دوستوں کی جگہ کچھ نئے چہرے میرے ساتھ گھوم رہے ہیں۔

شادی کا گھر ہے۔ پورا گھر رشتے داروں اور مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریحان ایک ایک کر کے مجھے سب سے ملوا رہا ہے۔ یہ میری امی ہیں، یہ میرے ابو ہیں، یہ میرے بھائی ہیں، یہ میری آپی ہے، یہ میرے چاچا ہیں، یہ میری چاچی ہیں اور یہ میری آنٹی ہیں۔ اس کے بعد ریحان سب کو مخاطب کرتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ''اور یہ میرے اسکول کا دوست 'زاہد' ہے۔'' ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہیں۔

سب سے ملاقات کرانے کے بعد ریحان مجھے گھر کے باہر لگے ایک منڈپ میں لے گیا۔ میں نے دیکھا وہاں ناشتے کے لیے بہت سارے اسٹال لگے ہوئے ہیں۔ منڈپ میں ایک طرف گول گپّے، چھولے، چاٹ مسالے، چاؤ مین غیرہ کے کارنر موجود ہیں تو دوسری طرف فروٹ سلاد، جوس، لسی، فالودہ اور آئس کریم کے اسٹال لگے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک کونے میں کافی کارنر کا بھی بورڈ لگا ہوا ہے۔ لوگ مستی سے ان تمام چیزوں کا لطف لے رہے ہیں۔ ہم دونوں بھی ان میں شامل ہوئے اور ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد کافی کارنر سے ایک ایک کپ گرما گرم کافی لی اور اسے پیتے ہوئے منڈپ سے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم دونوں دوبارہ گھر میں داخل ہوئے اور ایک نئے کمرے میں پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک اسٹیج بنا ہوا ہے، جس پر دولہا اور دلہن بیٹھے ہوئے ہیں۔ دولہا ایک خوبصوت شیروانی اور دلہن ایک مخصوص لباس پہنی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا اس جوڑے میں دونوں بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔ ساتھ میں اور بھی کرسیاں لگی ہوئی ہیں، جس پر گھر کے لوگوں کے ساتھ

دوسرے رشتے دار بھی بیٹھے دکھائی دے رہے ہیں۔اسٹیج کے نیچے بہت ساری کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ان کرسیوں پر آنے والے مہمان اور دوست احباب اٹھتے بیٹھے اور کمرے سے آتے جاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ان میں سے کئی ایک دولہا اور دلہن کو بھینٹ میں تحفے تحائف بھی دے رہے ہیں۔ریحان مجھے اسٹیج کے پاس لے جاکر ان سے میرا تعارف کرایا۔میرے پاس تحفہ دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔میں نے آگے بڑھ کر دولہے سے مصافہ کیا اور اپنا نام بتاتے ہوئے دونوں کو شادی کی مبارک باد دی۔

وہاں سے نکل کر ہم لوگ منڈپ کی طرف واپس آئے۔میں نے دیکھا منڈپ میں ایک پارٹیشن لگا ہوا ہے۔پارٹیشن کی دوسری جانب کھانے کے لیے بہت سارے ٹیبل لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ کھانا کھانے میں مصروف بھی ہیں۔ ہم لوگ بھی پارٹیشن کے اس طرف پہنچے اور کھانا کھانے کی غرض سے ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔میں نے دیکھا ٹیبل پر ایک طرف مرغ مسلم،قصوری مرغ،افغانی چکن،مغلئی چکن، نظامی چکن،حیدرآبادی چکن،لاہوری چکن ،پنجابی چکن کے ڈونگوں کے ساتھ رومالی روٹی،تندوری روٹی،بٹر نان وغیرہ قرینے سے سجا کر رکھے ہوئے ہیں۔ٹیبل کی دوسری جانب مختلف قسم کی بریانی کے ساتھ شامی کباب،حسینی کباب، ریشمی کباب،کوفتے، چکن ٹکہ، تندوری چکن،فرائڈ فش،اپولو فش اور فش کباب موجود ہیں۔ساتھ میں شاہی حلوہ،شاہی ٹکڑے، چم چم ، رس ملائی کے علاوہ مختلف قسم کے سلاد اور مشروبات رکھے ہوئے ہیں۔ٹیبل کے بیچ میں منرل واٹر کا ایک بڑا سا باٹل رکھا ہوا ہے،جس کے چاروں طرف نل لگے ہوئے ہیں۔مختلف اقسام کے کھانوں سے بھرے میز کو دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔

مثمن مرغ کا تھا شامی کباب
حسینی کباب کفتے تھے بے حساب

اتنا سب کچھ ایک ساتھ دیکھ کر میری نظریں ٹیبل ہی پر ٹکی رہ گئیں۔میں کہاں ہوں؟ میرے ساتھ کون ہے؟ مجھے کون دیکھ رہا ہے؟ ان سب باتوں سے بے خبر میں بس ایک ٹک ٹیبل ہی کو گھور رہا ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کہاں سے کھانا شروع کروں۔

''زاہد بیٹا کیا کر رہے ہو؟''

''ارے عالیہ آنٹی آپ۔آپ کب آئیں؟''

''بس.....ابھی ابھی آئی ہوں۔''

''دیکھو نا آنٹی۔ کتنے قسم قسم کے کھانے ہیں اور لذیذ بھی لگ رہے ہیں۔ میں تو خوب مزے لے لے کر کھاؤں گا۔''

پہلے کیا.....؟ پہلے کیا.....؟ ہاں،حسینی کباب سے شروع کرتا ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔

''زاہد بیٹا اٹھو.....جلدی اٹھو۔کب تک سوتے رہو گے۔صبح کے سات بج رہے ہیں۔اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے۔''امی نے مجھے جگاتے ہوئے کہا۔

''اُوں.....ہوں.....ارے یہ کیا؟ میں یہاں کیسے آ گیا؟ میں تو.....؟''

''میں تو ریحان کے بھائی کی شادی میں کھانا؟''

''اوہ .....کیا امی،تھوڑی دیر اور رک جاتیں،میں کتنا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔''

''خواب بعد میں دیکھنا۔جلدی سے ریڈی ہو جا۔ٹیبل پر رکھے شامی کباب ، حسینی کباب اور پراٹھے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' کہتی ہوئی امی باہر کی طرف گئیں۔

''پیپ پیپ پی.....پی.....''

باہر اسکول بس کھڑی تھی اور ڈرائیور نان اسٹاپ ہارن بجائے جا رہا تھا۔

''آپ جایئے ۔ زاہد کو تیار ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔میں اسے اسکول بھیجوا دوں گی۔'' ممی نے بس ڈرائیور سے کہا۔

''عالیہ! اچھا ہوا تو آ گئی۔زاہد تیار ہو رہا ہے۔ اسے اسکول پہنچا دینا۔آج دیر سے سو کر اٹھا ہے۔بس چلی گئی ہے۔''امی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں،وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

فیاض حمید
ریسرچ اسکالر، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر، مدھیہ پردیش
رابطہ: 8602147215

خاموش آوازیں

کیا آپ نے کوئی خبر سنی دیدی؟ سائمہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔
کس کے متعلق..... دیدی بولی۔
سائمہ..... متعلق.....
نہیں۔ کیوں کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے نا؟ دیدی بولی۔
اب کیسے بولوں جب تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ سنو دیدی لیکن کسی کو بتانا نہیں، کچھ دن سے انٹرنیٹ پر ایک خبر پھیلائی جارہی ہے جس میں لوگوں سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ کم سے کم چھ مہینے یا اس سے زیادہ وقت تک کے لئے لوگوں کو ضروری اشیاء جمع رکھنے کے لئے کہا گیا ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے جگہوں سے آئے ہوئے سیاحوں کے لیے بھی یہ خبر تھی کہ جلد از جلد یہ جگہ خالی کر دیں۔ میں نے سنا ہے آج کل سب باہر کے لوگ یہاں سے بھاگے جارہے ہیں۔ سائمہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔۔
نہیں۔ نہیں۔ ایسا کیوں ہوگا۔ آپ نے غلط سنا ہوگا۔ دیدی بولی
پتہ ہے اُس میں شاید یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ ہونی والی ہے۔۔۔ سائمہ آنسو بھری آواز میں کہنے لگی۔
ارے نہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں، تمہیں تو پتہ ہے انٹرنیٹ پر ایسی خبریں اکثر پھیلائی جاتی ہیں۔ جو فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتیں۔ کیا اپ نے یہ خبر خود دیکھی؟۔۔
نہیں! میں کون سا انٹرنیٹ چلاتی ہوں جو میں دیکھو، لیکن کل گھر والے اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے، تب سے رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔۔
یہ سب جھوٹ ہے کوئی جنگ نہیں ہوگی اور نہ ہی کچھ، تم بس اللہ پر بھروسہ رکھو جو 'غفور الرحیم' ہے۔
لیکن یہ تو سچ ہے کہ آج کل پورے راستوں کو سیل کر دیا گیا ہے اور خالی فوج کی گاڑیوں کو چلنے کی اجازت ہے۔ اور تقریباً تمام فوج کو یہیں لایا جارہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوگا میں کل سے اتنی ڈر گئی دیدی دل کہتا ہے زور زور سے رولوں، صبح سے سر درد کی تین گولیاں کھا چکی ہوں لیکن کم ہونے کے بجائے یہ باتیں سن سن کر درد اور بڑھا جارہا ہے۔ خدا ہی جانے ہمارا کیا ہوگا؟ شاید آخری دن چل رہے ہیں؟ میں نے سوچا آپ سے ملاقات کر رکھوں پھر کیا بھروسہ زندگی کا؟ سائمہ آنسو بھری آواز میں کہتی رہی۔

ارے کیا ہوگیا ہے آپ کو ۔کوئی جنگ نہیں ہوگی اور نہ کچھ، تمہیں پتہ ہے نا شاید الیکشن ہونے والے ہے جس کے لئے فوج لائی جارہی ہے اور ہوسکتا ہے کہ سرحد پر بھی کچھ تناؤ ہو جس کی وجہ سے انھیں لایا جارہا ہو ، یہ تو ہماری حفاظت کے لیے ہی معمور ہیں۔دیدی بولی۔

پتہ نہیں دیدی، آپ کس دنیا میں رہتی ہو، ایسا بالکل نہیں ہے جو آپ سوچ رہے ہو.....تمہیں پتہ ہے ہمارے گھر میں اس وقت ماتم چل رہا ہے کیونکہ ہم نے ایک مہینے پہلے ہی سارا اناج بیچ دیا اور اب ہمارے گھر میں بالکل کچھ بچا ہی نہیں اگر جنگ ہوگی تو ہڑتال ہوگی اور ہمارے بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ تو بھوک سے مر جائیں گے.....سائمہ روتی ہوئی کہتی رہی۔

سائمہ چلی گئی تو دیدی اب اس کی کہی باتوں پر سوچنے لگی کہ اگر سچ میں ایسا ہونے والا ہے تو ہمارا کیا ہوگا۔وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسی اثناء میں اس کی منجھلی بیٹی جس کی عمر سات سال کی تھی دوڑتے دوڑتے روتی ہوئی اس کے پاس آئی اور ممی ! ممی چلاتی ہوئی کہنے لگی کہ ممی جنگ ہونے والی ہیں اور ہم سب مارے جائیں گے اور زور زور سے رونے لگی۔

آپ کو کس نے کہا یہ.....دیدی بولی۔

وہ روتے روتے کہتی رہی کہ فلاں عورت نانی کو باہر گیٹ پر بتا رہی تھی کہ جنگ ہوگی، لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ اگر ہم سب مر گئے تو ہماری زمین پر کون بس جائے گا۔جب لوگ ہی نہ رہے گے تو پھر کیا ہوگا؟ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کیا؟

دیدی نے بیٹی کو سنبھالتے ہوئے ہوئی کہا ارے پاگل بیٹی ! کتنی نادان ہوں ارے وہ اپنے گھر کی لڑائی کی بات کر رہی ہوگی کیونکہ آئے دن ان کے یہاں جھگڑا ہوتا رہتا ہے لیکن بیٹی ایک نہ مانی اور روتے روتے تھک کر گئے وہیں سو گئی اور دیدی کسی گہرے سوچ میں اس قدر کھو گئی کہ گیس پر رکھا ہوا دودھ کا بھرا ہوا پتیلہ پورے کچن میں پھیل گیا اور دودھ جلنے کی بو باہر تک پھیل گئی۔لیکن دیدی سوچ میں ڈوب گئی۔اسی اثنا میں دیدی کا شوہر دوڑتے دوڑتے کچن میں داخل ہوا تو وہ دنگ رہ گیا کیونکہ ماں بیٹی دونوں وہی بیٹھی تھیں۔شوہر نے پہلے گیس بند کیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ چونک گئی ۔گھبراتے ہوئے ۔۔آپ کب آئے؟۔۔بس ابھی آہی رہا تھا۔۔

لیکن آج جلدی کیوں آگئے کام سے اپ؟

سارے راستے بند پڑے ہیں ۔میں کام تک پہنچا ہی نہیں ۔آدھے راستہ سے ہی مشکل سے جان بچا کے گھر واپس آیا ہوں۔لاکھ لاکھ شکر اللہ کا۔۔

یا اللہ کیوں کیا ہوا؟۔۔دیدی بولی۔

ارے کچھ لڑکوں کو امتحان دینے کے لئے جانا تھا لیکن راستہ پوری طرح سیل تھا۔وہ افسر کے سامنے بہت منت سماجت کر رہے تھے، لیکن وہ ایک بھی نہیں مانا۔لڑکے بول رہے تھے کہ ہماری زندگی کا سوال ہے کہ ہم کئی سالوں سے اس امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔لیکن آفسر نے سیدھے انکار کر دیا ، اور دوسری طرف لڑکے برابر التجا کرتے رہے اور میں بھی وہاں پہنچ گیا۔اس کے بعد افسر نے سپاہوں کے ذریعہ ان کو بھگانے کی کوشش کی لیکن یہ پھر بھی ہاتھ جوڑ کر جانے کے لئے اجازت لیتے رہے، لیکن اس کے بعد سپاہوں نے ان پر ڈنڈے برسانے شروع کئے ، اور پھر جواب میں ان لڑکوں نے بھی پتھر مارے اور میں وہاں سے بھاگ نکلا، لیکن کچھ دوری کے بعد ہی گولیوں اور پلٹ کی آوازیں آئی اور یہ سنا کہ ان لڑکوں میں سے ایک کے آنکھوں میں پلٹ اور دوسرے کے دائیں ہاتھ میں گولی لگ گئی ہیں۔باقی حال اللہ جانے.....

اوہ۔اللہ۔رحم کر۔۔اس اثناء میں ان کی بڑی بیٹی جس کی عمر نو سال کی تھی کچن میں داخل ہوئی اور کہنے لگی کہ ممی ! ممی ہمیں اسکول سے چھٹی مل گئی ہے۔اور کہا گیا ہے کہ جب تک ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر اسکول آنے کا اعلان نہ کیا جائے تب تک نہیں آنا۔۔

کیوں اسکول میں چھٹی کیوں ؟ ابھی تو بارہ ہی بج گئے ہیں۔کیا اسکول بند ہوگئے؟۔۔۔دیدی بولی

ہاں شاید۔۔میں جب ابھی گھر کی طرف آرہا تھا تو مجھے سڑکوں پر اکثر جگہوں پر اسکولی بچے ملے جو گھروں کی طرف واپس روانہ ہو رہے تھے اور جن کے چہروں پر مایوسی نظر آرہی تھی۔۔شوہر بولا۔

اللہ اب کیا ہوگا۔پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے؟

کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔بس یہ بتاؤ والد صاحب کہاں ہے کہیں نظر ہی نہیں آرہے ہیں؟

صبح تو باہر ہی تھے۔۔پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔منجھلی بیٹی بولی۔

اُن سے کہو کہ زیادہ ادھر اُدھر نہ گھوما کریں، حالات بہت خراب ہیں اور آپ بھی گیٹ سے باہر مت جانا، گھر کے اندر ہی ٹی وی دیکھتے رہو۔میں والد صاحب کو فون لگا کے پوچھتا ہوں کہ کہاں ہو؟

ارے کیسا ٹی وی اور کیسا فون وہ تو کل ہی بند ہوگئے تھے۔پہلے انٹرنیٹ بند ہوتا تھا لیکن اس بار فون بھی بند ہوگیا ہے اور ساتھ ساتھ ٹی وی کی بھی ساری چینلیں بند کر دی گئی ہیں۔۔دیدی بولی۔

سب ایک دوسرے کے چہروے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ ہر کسی کے چہرے پر مایوسی اور ڈر نمایاں تھا۔یہاں تک کہ بچے بھی باہر جانے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔اس اثناء میں دیدی اپنے شوہر کی طرف مخاطب ہوئی اور سائمہ نے جو کچھ بتایا وہ سب کچھ سنانے لگی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئی کہ وہ بول رہی تھی کہ چھ مہینے تک ضروری اشیاء جمع رکھنا ہے لیکن ہمارے پاس مشکل سے پانچ یا دس دن کی ہے اب کیا ہوگا ؟ کیا میرے یہ ننھے بچے بھوک سے مر جائینگے۔یا اللہ ان معصوموں کا کیا ہوگا ان کی کیا خطا ہے اور وہ زور زور سے رونے لگی۔۔

ارے کیا ہوگیا ہے۔آپ کو۔آپ ایسا کروں گے تو ان کی ہمت اور پست ہوجائے گی ۔تم ان معصوموں کی ہمت بڑھانے کے بجائے اور گھٹا رہی ہو۔سب ٹھیک ہوگا یہ میرے بچے ہیں اگر مرنا ہوگا تو سب ایک ساتھ مرے گے۔یہ دلاسہ دے کر وہ کچن سے باہر چلا گیا۔باہر جاتے ہی وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تو سچ ہے کہ گھر میں مشکل سے کچھ دن کا اناج بچا ہوا ہے اگر حالات اور خراب ہوئے تو میرے بچوں کا کیا ہوگا یہ روز قیامت مجھے اللہ کے سامنے کھڑا کر کے پوچھیں گے کہ اس شخص نے ہمیں بھوکا رکھ رکھ کے مار ڈالا تھا ۔کچھ بھی ہولہذا مجھے کہیں سے انتظام کرنا ہوگا۔وہ بس گیٹ سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کے والد کندھے پر اناج کی ایک بوری لے کر آئے انکے چہرے اور جسم سے پسینے کا دریا بہہ رہا تھا۔بیٹے نے باپ کو اس حالت میں دیکھا تو دوڑتے دوڑتے انکے پاس گیا اور انکے کندھے سے اناج کی بوری اُتار کر اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور والد کو غصہ سے یہ کہا کہ آپ کی عمر یہ نہیں رہی کہ اتنا بھاری وزن آپ اُٹھا سکو ۔لیکن تبھی والد صاحب اپنی سانس سنبھالتے ہوئے بیٹے سے کہنے لگے کہ صبح سویرے جب ریڈیو آن کیا تو یہ خبر سنی کہ حالات خراب ہونے والے ہیں۔گھر میں اناج کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ دن میں ختم ہونے والا ہے۔سوچا ہم نے اپنی زندگی گزار لی لیکن تمہارے بچوں کا کیا ہوگا جو میرے دل کے دھڑکن ہیں ۔خدانخواستہ بھوک سے مر گئے تو قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔سات کلومیٹر کی دوری پر اناج کا پتہ ملا تو وہاں چلا گیا۔اور خرید کر کچھ وقت گاڑی کا انتظار کیا لیکن وہ نا پید تھی لہذا کندھے پر رکھ کر وہاں سے لے کر آیا ہوں پورے سوا تین گھنٹے سے چل کر آرہا ہوں۔تمہیں پتہ ہے بس سڑکوں پر پیدل چلنے والے ہی نظر آرہے ہیں کیونکہ انھیں کوئی روکتا نہیں اور گاڑیوں کا تو دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ملا اور ہاں ان حالات میں اشیاء ضروریات کے دام آسمان چھو رہے ہیں۔چار سو کا مال ہزار میں مل رہا ہے۔ میں نے سرکاری ریٹ کے حساب سے پیسے لیے تھے لیکن وہاں بھی ڈبل سے زیادہ ریٹ چل رہا ہے اور لوگ بے چارے حالات کے مارے چپ چاپ لے جارہے ہیں۔میں نے دو بوری کے لئے پیسے لئے تھے لیکن وہاں ریٹ اتنا تھا کہ یہ آدھی بھی مشکل سے مل سکی۔اب شکر اللہ کا بچوں کے لئے کچھ تو مل گیا۔

اس کے بعد وہ کچن میں داخل ہوئے اور بیٹے کے بچوں کو چومنے لگے کہ باہر سے انکی بیوی داخل ہوئی جو کچھ گھبرائے ہوئے تھی اور بس اتنا ہی کہہ گئی کہ میں نے گیٹ میں کنڈی لگا دی اس کے ساتھ اس کا پوتا تھا جس کی عمر چار سال کی تھی جو دوڑتے دوڑتے اپنی ماں سے چپک گیا۔دن میں بھی کنڈی کیوں.....؟

ہاں تم نے نہیں سنا پاس کے گاؤں میں کچھ لڑکوں کو غائب کیا گیا ہے اور مکانوں کے دروازے ،کھڑکیاں اور شیشے بھی توڑے گئے یہاں تک کہ تمام لیڈروں کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔لیکن ایسا کیوں ؟ پتہ نہیں ۔اب کس سے پوچھیں ۔جب کوئی رابطہ ہی نہیں ہے کسی کے ساتھ۔اللہ رحم کرے۔۔

اس اثناء میں باہر سے اسپیکروں پر یہ اعلان کیا گیا کہ لوگوں! باہر مت نکلنا چاروں طرف دفعہ ۱۴۴ لگا دیا گیا ہے۔یہ سن کر دور دور تک خاموشی طاری ہوگئی اور وہ یہ سب سن کر کچن میں ہی ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے ۔وہ ایک دوسرے کو حوصلہ دینا چاہتے تھے لیکن ان کی آوازیں ان کے حلق سے نکل نہیں پا رہی تھیں اور بڑوں کے سامنے بچے بھی اس انداز سے خاموش بیٹھے تھے کہ سانس لینے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی ۔وہ جو ایک بھی منٹ چپ نہیں رہتے تھے آج وہ بھی خاموش ہوگئے تھے ۔دوسری طرف باقی افرادخانہ چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے بس آنسوں نکل رہے تھے جو ان کی آواز بن کر یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس ڈر اور خوف نے ان کی قوت گویائی چھین لی ہے۔

وہ زور زور سے رو رو کر چیخنا، چلّانا چاہتے تھے لیکن خاموش رہنے پر مجبور تھے اور اگر چیختے چلّاتے بھی تو ان کی آواز سننے والا دور دور تک کوئی نہ تھا۔

❑❑❑

میرا نیس نمبر

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔انہیں میں سے ایک 'میر انیس نمبر' بھی شامل ہے۔ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۱۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

غزل

زندگی مانگے ہے اب تنہائیاں
نکہتیں، خاموشیاں، پروائیاں

سبز ہوں یا زرد پتے شاخ پر
ایک سی دونوں کی ہیں پرچھائیاں

نغمہ زن ہے میرے اندر اک سکوت
دور جیسے گونجتی شہنائیاں

ایک مدت سے کوئی دستک نہیں
تھک گئیں شاید مری رسوائیاں

عہد رفتہ کی نشانی بن گئے
وہ تبسم، جھیل سی گہرائیاں

اشک آنکھوں سے چھلکنے اب لگے
رائیگاں جانے لگیں پُروائیاں

کاشفؔ اپنی زندگی پر ناز کر
قربتیں، سرگوشیاں، رعنائیاں

کاشف بن قمر مرادآبادی
جگر کالونی، سول لائنس، لکھنؤ
موبائل: 9412650515

غزل

ٹوٹتے رشتوں کے یُگ میں آسرا کوئی نہیں
اب ہمارا آپ کے غم کے سوا کوئی نہیں

سب مرے چہرے کی رونق دیکھ کر ہیں مطمئن
زخم کتنے دل میں ہیں یہ دیکھتا کوئی نہیں

آ گئی خود اعتمادی کی وہ منزل زیست میں
مسکرانے کے سوا اب راستہ کوئی نہیں

مارتا ہے شہر کی رونق پہ شب خوں وقت آج
'سب کے منھ میں ہیں زبانیں بولتا کوئی نہیں'

میری آوارہ مزاجی کی ہے شہرت ہر طرف
کس سے کس سے یہ بتاؤں اب مرا کوئی نہیں

اس طرف کو چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
جس طرف کہتی ہے دنیا راستہ کوئی نہیں

ہو گیا ہوں ان سے ہم آہنگ جینے کے لئے
رنج و غم سے مجھ کو تابشؔ اب گلہ کوئی نہیں

طلحہ تابشؔ
سیتارام گلی، اسٹیشن روڈ، پرتاپ گڑھ، یوپی
موبائل: 9044676517

غزل

ذات باری ہے بس بقا کے لئے
باقی سب کچھ فقط فنا کے لئے

جب کبھی میں سفر پہ جاتا ہوں
ماں کے ہاتھ اٹھتے ہیں دعا کے لئے

وہ ہے معبود اور ہم بندے
بندگی وقف ہے خدا کے لئے

اس کو ہرگز نہ بھول پاؤں گا
ہو گیا وہ جدا سدا کے لئے

مجھ پہ کرتا رہا جفائیں وہ
میں ترستا رہا وفا کے لئے

بچہ میرا شریر ہے لیکن
کچھ نہ کہنا اسے خدا کے لئے

عشق احمد ضروری ہے اظہرؔ
جذب اخلاص کی جلا کے لئے

کے۔انیس اظہر
خطیب اسٹریٹ، بڑی پیٹ پوسٹ، واغباڑی، ویلور
موبائل: 9003858940

غزل

چاند کو خورشید سمجھے ہے دل بیتاب جب
رات کو سمجھے گا دن ہوگا یہ محو خواب جب

ہو گئے غرقاب کتنے عاشقوں کے قافلے
سرمئی آنکھوں کے آنسو ہو گئے سیلاب جب

آ گیا اس کی خریداری کو اک جمِّ غفیر
کر دیا ہم نے دلِ معشوق کو نایاب جب

گر چہ وہ تہذیب کے بانی تھے منھ تکنے لگے
ان سے پہلے بڑھ کے ہم نے کرلیا آداب جب

کاٹنے آئے بھی وہ افسوس ایسے وقت میں
ہو گیا برسوں کی محنت سے شجر شاداب جب

یاد بھی آیا تو اب آیا اسے پروردگار
غرق ہونے کو ہوا ظالم سرِ گرداب جب

خلد کا رضوان کیا کچھ سوچتا ہوگا مشیرؔ
مستقر سمجھے ہے آدم حرکت سیماب جب

مشیر مصطفوی
مصطفیٰ آباد، نگپور، جلالپور، امبیڈکرنگر
موبائل: 9791449398

شارب ردولوی کی تنقیدی تصنیف جگر فن اور شخصیت ذوق شناسان ادب کے لئے کئی زاویوں سے اہمیت کی حامل ہے جسے جگر شناسی کے باب میں دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔اس کی اہمیت اور افادیت کی خاص وجہ یہ ہے کہ عہد حاضر کے معتبر ادیب و نقاد، علم داں، علم نواز، نکتہ داں، نکتہ شناس، علم و فضل کے بحر بیکراں پروفیسر علی احمد فاطمی کی تخلیقیت نے نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ مشرقی ادب سے انکی وابستگی کا بھر پور مظاہرہ کیا ہے اور ان کا ایک طویل اور بسیط مقدمہ بھی اس کے اندرجات میں شامل ہے جسے فاطمی فہمی کے ایک نئے موڑ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔مقدمہ و پیش کش میں پروفیسر فاطمی نے ادب برائے زندگی کے نظریے کا وہ خوبصورت والہانہ انداز پیش کیا ہے جس سے جگر مرادآبادی کے فن پاروں کی وسعت و ہمہ گیری سے نا صرف قاری مرغوب ہوتا ہے بلکہ تخلیق کی مسافت معنویت اور امکانات کی تہیں بھی روشن ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں جگر مرادآبادی کی شخصیت ان کے ذہن رسا اور فکری نفسیاتی جذباتی عوامل بھی تشکیل پاتے ہیں وہیں فکر و دانش کی نوعیت اور معیار بھی مرتسم ہوتا ہے ۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے جگر کے فن پاروں پر ژرف نگاہی اور دیانت داری کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے ۔ تنقید یں غیر جانب داری اور گہرے تجزیے و نقوش سے ہم کنار ہیں ۔جگر فن اور شخصیت پر آپ کا بسیط مقدمہ جگر کی شعری کائنات کی طرف ایک پر زور قدم ہے۔اس معنی خیز گفتگو کو اگر اس کتاب کا ماحصل اور نچوڑ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ پروفیسر فاطمی کی یہی کوشش ہے کہ علم مباحث کو افہام و تفہیم کے قالب میں سمو دیا جائے پروفیسر فاطمی کا یہ قدم باعث تشفی و تسکین بخش ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی کے تنقیدی رویوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”۔۔ان کے منطقی رویے ور استدلالی نظریے سے اختلاف نہیں کرسکتے کہ وہ جو بھی رائے قائم کرتے ہیں اس کے اسباب و علل بھی پیش کرتے ہیں اور اپنی گفتگو، تجزیہ اور نتیجہ سب کے سب دلائل و براہین کے ساتھ ادا کرتے ہیں ۔شارب صاحب کی ایسی سجی ہوئی مدلل اور متوازن گفتگو شارب صاحب کے فکر و نظر کی راہیں ہموار کرتی ہیں اور اسی راہ پر چل کر وہ پختہ تر اور بزرگ تر ہوتے گئے۔“

(شارب ردولوی کا تنقیدی سفر۔ادب و ثقافت ستمبر ۲۰۱۸ء ص۸۶)

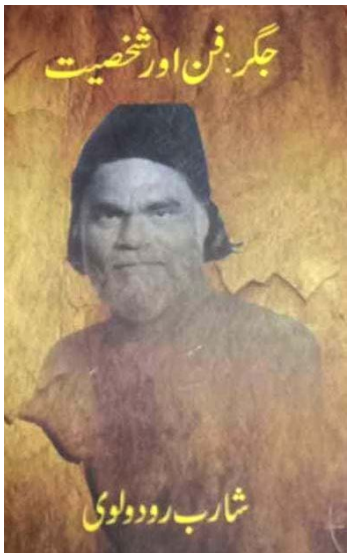

مبصر : ڈاکٹر زیبا محمود

قیمت : 200 روپئے

ناشر : رجحان پبلیکیشنز، الہ آباد

ملنے کا پتہ

رجحان پبلیکیشنز، دانش محل، لکھنؤ و دیگر کتب فروش

پروفیسر فاطمی شارب ردولوی کے اردو تنقید کے دائمی نقوش کا اور تخلیقی تنقید میں جو خدمات انجام دیں اس کے معترف ضرور ہیں اور بڑی دل جمعی کے ساتھ جگر مرادآبادی کی ادبی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی سعی میں کامیاب ہوئے ہیں۔مقدمے میں لکھتے ہیں:

”۔۔۔کہ جگر فن اور شخصیت شارب ردولوی کی مکمل کتاب ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جگر کی شخصیت و شاعری پر پہلی کتاب ہے اور خود شارب صاحب کی بھی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۶۱ء میں پہلی بار الہ آباد سے شائع ہوئی۔ جواب نایاب ہے۔اس کی نایابی اور کمیابی کو دیکھتے ہوئے اس کی اشاعت نو کے بارے میں سوچا گیا۔جگر کی شاعری کی مقبولیت اور شارب صاحب کی تنقید کی معروضیت کے پیش نظر اس کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔“

(جگر: فن اور شخصیت ص ۳۱)

جگر فن اور شخصیت شارب ردولوی کے نوجوانی کے ایام کا نادر نمونہ ہے جسے ان کی پہلی تصنیف ہونے کا شرف حاصل ہے اور جس نے ان کے تنقیدی فکر کو واضح کر دیا اور بحیثیت معتبر نقادان کے شناخت نامہ کو مرتب کر دیا۔حیات اور شخصیت سے تعلق ان کی تحریروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جگر علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور لکھنو کا ادبی پس منظر ان کو راس آ گیا۔ شاعر کی فطرت، افتاد طبع اور جبلت بہر حال اپنا انفرادی مقام رکھتی ہے۔ جس زمانے میں جگر کی شاعری وجود میں آئی اس وقت غزل کے سانچے نے ایک بار پھر کروٹ لے لیا۔جس وقت جگر کے فن پاروں کی دھوم تھی اس وقت شارب صاحب کے قلم نے چلنا شروع کیا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ خوبصورت پر اثر معیاری شاعری اور معیاری تخلیق خود تنقید کے راستے ہموار کر لیتی ہے۔ شارب صاحب نے جگر فن اور شاعری کے ذریعے جس سنجیدہ اور پختہ فکر کا مظاہرہ کیا اس پر وہ آگے بڑھتے گئے اور ترقی پسند تنقید کی بلند بانگ عمارت کے اہم سطون قرار دے گئے اور آج بھی اسی زور و شور سے اسی راہ پر گامزن ہیں۔شارب صاحب کے سلجھے ذہن اور سنبھلتے ہوئے رشحات قلم کے زیر اثر جگر اردو شاعری کے قلب و جگر کا حصہ بن گئے بلکہ اردو زبان و ادب کا اور فکر و فن کا نا قابل فراموش اثاثہ بھی ثابت ہو گئے۔

شارب صاحب کو جگر سے بڑی شیفتگی رہی ہے۔ ترقی پسند تنقید نے خواص کے ساتھ عوام سے اپنا رشتہ مستحکم کیا۔ جگر کے شعری فن پاروں میں جو نزاکت جو حلاوت جو نرمی جو محبت اور دوستی ہے وہ اردو داں طبقے کو کیف وسرور میں شرابور کرتی ہے۔ دراصل جگر غزل کے ذریعے اور غزل جگر کے ذریعے پہنچانی جاتی ہے۔ کتاب کی اشد ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر فاطمی نے اس کا دوسرا اڈیشن منظر عام پر لانے کے لئے جو جہد مسلسل کیا وہ جوئے شیر لانے کے فن کے مترادف ہے۔ فاطمی صاحب نے دوٹوک انداز بیان میں اس امر کی تصدیق کر دیا کہ ہر اشتراکی ترقی پسند ہوتا ہے لیکن ہر ترقی پسند کا اشتراکی ہونا ضروری نہیں۔ شارب صاحب ترقی پسند نقاد ضرور ہیں لیکن انھوں نے ادب میں ادبیت کو فروغ دیا اور تعصب سے بے نیاز آپ کے ادبی فن پارے ہمیشہ سنجیدہ اور غائر مطالعہ کا عکس ثابت ہوئے ہیں۔ شارب ردولوی نے شعلۂ طور کے دباچے میں جگر کے ارتقائی ذہن کا تجزیہ یوں پیش کرتے ہیں کہ یہاں پر ان کا پختہ ناقدانہ شعور دیکھا جا سکتا ہے۔

''ہم جگر کو ایک عظیم شاعر نہیں کہہ سکتے۔ عظیم ان معنوں میں جن میں ہم غالب یا اقبال کو عظیم کہتے ہیں۔ اس لئے کہ غالب یا اقبال جیسی فلسفیانہ گہرائی اور سنجیدہ فکر جگر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔''

(جگر: فن اور شخصیت ص ۲۲)

وہ قیمتی جملہ کہتے ہیں جسے طلبائے ادب کو زریں حروف میں اپنی یادداشتوں میں درج کر لینا چاہیئے اور اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لینا چاہیئے کہ 'اختلاف بھی تنقید میں نئے ابعاد کے نمو کا ذریعہ ہے'۔ لیکن وہ جگر کی شاعری کے اس پہلو کے بھی متلاشی ہیں جہاں جگر کا نظریہ شاعری صرف اور صرف حسن وعشق کی سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ مومن، داغ، رسا، تسلیم اور حسرت سے زیادہ قریب ہیں۔ جگر کا نظریے شاعری صرف حسن وعشق کو بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ حجابات حسن و عشق میں بھی بعض فکر انگیز باتیں اور عشق وسرمستی کے پردے میں بعض پختہ خیالات ضرور پیش کر دیتے ہیں۔''

(جگر: فن اور شخصیت ص ۲۲)

شعلۂ طور کا مطالعہ اس نتیجے پر پہونچاتا ہے کہ متن میں صداقت کلام کی جان ہے اور سادگی اس کی زینت سخن کی پرکاری اور الفاظ جہاں زبان کے قالب میں ڈھل جانے کا نام ہے۔

جگر شاعری کو پیغام تسلیم کرتے تھے اس لئے ان کے اس شعر کو عوام وخواص میں ضرب المثل کا درجہ مل گیا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

شارب ردولوی کی تحقیق کے مطابق جگر ایک صحت مند سیاسی شعور بھی رکھتے تھے جس میں سیاسی طنز کے ساتھ سماجی شعور بھی بے نقاب ہوا ہے جس میں ایک شدید احساس اور اضطراری کیفیت پوشیدہ ہے۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
ساز حیات ساز شکستہ ہے ان دنوں
بزم خیال جنت ویراں ہے آج کل

شارب ردولوی نے جگر کے تخلیقی سفر کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے پہلا حصہ داغ جگر سے شعلۂ طور تک اور دوسرا طویل حصہ آتش گل کے کلام تک کو محیط ہے۔ تنقیدی عمل سے متعلق شارب ردولوی کے تنقیدی نقوش بصیرت افروز ہیں۔

''۔۔۔تنقید میرے خیال میں نہ تو عیب جوئی ہے اور نہ قصیدہ خوانی بلکہ ایک حد تک تخلیقی کام ہے جو ادیب یا شاعر کے کارناموں کی صحیح حیثیت متعین کرتی ہے۔ نقاد کا کام شیشہ گری سے زیادہ نازک اور خضر کی رہنمائی سے زیادہ ذمہ داری کا کام ہے۔ نقاد کا غیر جانب دار رہنا اس کا اولین فرض ہے ورنہ وہ صحت مند عملی تنقید کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اچھے اور برے کا امتیاز کرنا اور دیانت داری اور غیر جانب داری سے پیش کر دینا ہی تنقید ہے۔''

(جگر: فن اور شخصیت ص ۱۴)

جگر فن اور شخصیت میں شارب ردولوی کا جو تنقیدی اور تحقیقی شعور نمایاں ہے اس کے رقبے کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ یہ ہنر اور عقابی نظر سماجی منصب سے نہیں بلکہ تبحر علمی سے حاصل ہوئی ہے اور جس کے سبب پھر اسی اشتیاق سے نظام قرأت میں لامحدود قرأت بے کنار ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنی علمی فراست کا بھر پور مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ شعر فہمی کے تذکراتی اظہار کی رو سے مشرقی شعریات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خوب ہے جس سے جگر کے ادب پاروں کی افہام وتفہیم کے بعد باذوق قاری کسی حتمی فیصلے صادر کرنے پر قادر ہو جاتا ہے شارب ردولوی نے اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر مواد وموضوعات اور اس کی ہیئت و اظہاریت کا بھر پور والہانہ انداز استوار کیا ہے۔ اگر مطالعات جگر پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہاں تعبیرات وتفہیمات کی ایک الگ دنیا ہے۔ فن وادب سے متعلق ان کا مطالعہ تخلیق کار اور فن پارے کا مشاہدہ، ان کی شخصیت کے وہ اجزاء ہیں جو تنقید کے غائر مطالعہ پر محیط ہیں۔ ایک قطرہ مختلف مراحل سے گزر کر گہر بن جاتا ہے۔ شارب ردولوی کے نقد ونظر کا معیار بھی ان مراحل سے گزر کے ہی قائم ہوا۔ آپ تشکیل کی جگہ تخلیق کی کوشیشوں میں سرگرداں نظر آتے ہیں کیونکہ تخلیقی ادب ہی وہ محور ومرکز ہے جس کے اطراف تنقید وتحقیق کی سرگرمیاں پیش آتی ہیں۔ تنقید میں خوشگوار اضافوں کی جستجو میں محو خرام اور ایک جہان تازہ کی دریافت میں کوشاں ہیں۔

❑❑❑

آپ کے خطوط

ماہنامہ 'نیا دور' اپنی ترتیبِ مضامین اور معیاری، تہذیبی وادبی تخلیقات کے لئے ہندوستان سے شائع والے تمام اردو رسائل میں ایک اہم اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین کی ترتیب وتزئین دیکھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔

اداریہ کے تحت 'اپنی بات' میں شمارے میں شامل تمام مضامین کا مختصر تعارف پیش کرنے کا انداز نہایت عمدہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے 'اپنی بات' کا کالم بیحد پسند آتا ہے اور سب سے پہلے میں اسی کو پڑھتی ہوں۔

مئی، جون، جولائی اور اگست ۲۰۱۹ء کے شماروں میں شامل تمام مضامین بہت اہمیت رکھتے ہیں، خصوصی طور پر اردو ادب کے طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کے لئے۔ آپ کے مضامین کے انتخاب کی داد دیتی ہوں اور مادری زبان اردو کے لئے کی گئی کاوشوں کے لئے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ نیا دور ہمیشہ ایک باوقار جریدہ مانا گیا ہے لیکن جب سے آپ نے نظامِ ادارت سنبھالا ہے اس کا صوری اور معنوی حسن قابلِ رشک ہوگیا ہے۔ مضامین، نثر و نظم کا انتخاب اور ان کی ترتیب آپ کے اعلیٰ اور معیاری ادارتی ذوق کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر پروین شجاعت

شعبہ اردو، ممتاز پی جی کالج لکھنؤ

نیا دور ان چند رسالوں میں سے ہے جن کا مجھے انتظار رہتا ہے۔ آپ نے نیا دور کو کافی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ آپ کی محنت اور لگن کے گواہ نیا دور کے شمارے ہیں۔

جولائی اور اگست کے شمارے۔ میرے سامنے ہیں۔ دونوں ہی شمارے بھرپور ہیں اور ذہن کو مطمئن کرتے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں آپ نے کچھ۔ بہت اچھے مضامین شامل کر رکھے ہیں۔ مثلاً نیر مسعود پر ڈاکٹر رفیق احمد کا۔ اس مضمون کو بہت اچھے تجزیہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

شمع ادب اپنے دور کا بہترین جریدہ تھا۔ یہ رسالہ ایک لمبے عرصہ تک نکلتا رہا اور قارئین کے ذوق کی آبیاری کرتا رہا۔ نیر سلطان پوری جیسے بے لوث مدیر اب کہاں ہوتے ہیں۔ شمع۔ادب پر نیاز صاحب کا مضمون بہت بھرپور ہے۔ جوش اور فانی پر بھی اچھے۔مضامین ہیں ۔ محمد یاسین کا افسانہ قصۂ آدم وابلیس اچھا افسانہ ہے۔

اسی طرح سے اگست کا شمارہ بھی شاندار ہے۔ شارب کی خاکہ نگاری پر مضمون ہو یا خود نوشت سوانح نگاری کا انشائی زاویہ۔ دونوں ہی مضمون بہت اچھے ہیں۔ خان فاروق کا مضمون کا بہت عالمانہ ہے۔ تبصرے بھی اچھے ہیں۔

کل ملا کر یہ دونوں شمارے بہت اچھے ہیں۔ میری طرف سے سید عاصم رضا قابل مبارکباد ہیں۔

اسرار گاندھی

الہٰ آباد (یوپی)

رسالہ نیا دور (جولائی ۲۰۱۹ء) نظر نواز ہوا۔ رسالہ کے مشمولات انتہائی وقیع ہیں۔ حصہ نثر میں پروفیسر نیر مسعود حیات اور فکری جہات، نئی تاریخیت اور نئی مارکسیت، دبستان لکھنؤ کل اور آج، جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری اور فانی کی شاعری کے کچھ اہم رموز ونکات میں کئی اہم باتوں پر معنی خیز روشنی ڈالی گئی ہے۔ خصوصاً ماہنامہ شمع ادب ایک نظر میں قابل قدر مضمون ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ نیر سلطانپوری کی صحافی خدمات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وادبی خدمات کا احاطہ جس خوبی سے کیا گیا ہے۔ وہ اردو کے قارئین کے علم میں اضافہ کا سبب ہے۔ رضیہ پروین، گلشن بانو وفا اور مرغوب حیدر عابدی نے اپنے مضامین میں بعض نئی باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ ماہنامہ نیا دور کے اس شمارے میں افسانہ انمول تجارت، خالی پنجرہ، قصۂ آدم وابلیس اور سودا مختلف سماجی مسائل اور موضوعات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حصہ نظم بھی کافی اہم ہے۔ ڈاکٹر غلام اشرف قادری نے 'فکر کی نقاشیاں' پر معلومات افزا تبصرہ کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کے عہد ادارت میں رسالہ کے معیار کو جس طرح ترجیح دی گئی ہے اس سے ماہنامہ نیا دور کے وقار میں اضافہ ہوا ہے اس کے لئے مدیر اعلیٰ کو مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔

ریتیکا شریواستو

۱۵۴،۔۔۔۔۔نگر امرتسر

جولائی ۲۰۱۹ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ حالانکہ یہ شمارہ ذرا تاخیر سے منظر عام پر آیا لیکن انتظار کا پھل میٹھا ہوتا ہے کے مصداق فہرست دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ نیر مسعود میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ مضمون پروفیسر نیر مسعود حیات اور فکری جہات (ڈاکٹر رفیق احمد) نے بہت متاثر کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے جس طرح نیر مسعود کی فکری جہات پر روشنی ڈالی ہے یقینا قاری کے لئے بہت اہم ہے۔

اس شمارے میں کہکشاں لطیف کا مضمون 'نئی تاریخیت اور نئی مارکسیت' بہت پسند آیا۔ محی بخش قادری نے اپنے مضمون دبستان لکھنؤ میں گزشتہ سو برس میں ہونے والی ادبی تبدیلیوں کی طرف خصوصی اشارے کئے ہیں۔ وہ ہم سب کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایک اہم بات اور قابل تحسین کام نیا دور کا یہ بھی ہے کہ اس شمارے میں ماہنامہ شمع ادب جس کے نام سے بھی غالباً نئی نسل واقف نہ ہوگی پر ایک خصوصی مضمون شامل ہے۔ اپنے عہد کے مشہور شاعر سید توکل حسین نیر سلطانپوری اس رسالے کو نکالتے تھے۔ اس رسالے میں اس زمانے کے علمی وادبی مباحث کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ نیاز سلطانپوری نے اپنے مضمون شمع ادب کا ایک نظر سے عنوان سے اس رسالے کے اشاریہ کا ایک خاکہ پیش کیا ہے یقینا یہ ایک بڑی کاوش ہے جس پر مزید توجہ سے کام کر کے اس رسالہ کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ شریف الحسن نقوی صاحب سے میری ملاقات رہی ہے۔ میں نے انہیں دیکھا ہے اور ایسے شریف النفس انسان کی ادبی خدمات کا اعتراف لائق تحسین عمل ہے۔ اس کے بعد مرغوب حیدر عابدی صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد۔ مضمون کا عنوان بھی بہت خوب ہے۔ در جہان رنگ وبو یک مرد خوش اطوار بود، سلمیٰ صاحبہ کو ابھی تک میں بحیثیت شاعرہ ہی پڑھتا آیا تھا۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، اب معلوم ہوا۔ ایک خوبصورت کہانی کے لئے انہیں تہہ دل سے مبارکباد۔ غزلوں کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ اس خوبصورت ماہنامہ کے لئے ایڈیٹر عاصم رضا صاحب کو دلی مبارکباد۔

ڈاکٹر قمر الزماں

ضیاءالدین اپارٹمنٹ

بی۱، دوہرہ، علی گڑھ

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ مہاتما گاندھی کی ۱۵۰ویں جینتی کے موقع پر 1090 چوراہے پر منعقد
’صفائی ہی خدمت‘ کے تحت منعقد پروگرام میں مستفیدین کو کپڑے کا تھیلا دیتے ہوئے (۲؍اکتوبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ مہاتما گاندھی کی ۱۵۰ویں جینتی کے موقع پر اندرا گاندھی پرتشٹھان میں منعقد
’اتر پردیش کھادی مہوتسو-۲۰۱۹ء‘ کے افتتاح کے موقع پر کمہار کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے (۲؍اکتوبر ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی گورنر عزت مآب آنندی بین اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گاندھی جینتی کے موقع پر جی پی او لکھنؤ واقع ان کے مجسمہ سے ودھان سبھا کے
صدر دروازے تک گاندھی جی کے بھیس میں ان کے پیغامات کی تختیاں لئے ہوئے ۱۵۱؍بچوں کے پیدل سفر کو پرچم دکھا کر روانہ کرتے ہوئے (۲؍اکتوبر ۲۰۱۹ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

گاندھی جی کی ڈیڑھ سوسالہ یوم پیدائش کے موقع پر تاریخ میں پہلی بار چھتیس گھنٹے کی ودھان سبھا میں وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ایوان کو خطاب کرتے ہوئے (۲/۳ اکتوبر ۲۰۱۹ء)

वर्ष : 74 अंक 6
अक्तूबर 2019
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, f'kf'kj] निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**